

1138

RAMPUR RAZA LIBRARY
RAMPUR

جولائی ۱۹۶۴ء

7 - AUG 1964

۲۴۹۲۵۶
۱۱۱

پاکستان کا

نیاز فحش پوری
مدیر اعلیٰ

لانچر چندہ : دس روپے
تت فی کاپی : پچھتر پیسے

ستمبر
۱۹۶۲ء
میں

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

شائع
کیا
جارہا ہے



~~~~~ (مؤتبّر :- نیاز فنجوری) ~~~~~

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو شیخ حرم بھی ہے اور رند شاہد باز بھی اس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں ردِ نما ہوئی ہے اور اس میں ہل ذوق کیلئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ

”مومن کے نمبر“  
کے مطالعہ سے ہوگا،

اس نمبر میں مومن کی سوانح حیاتِ معاشقہ اس کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری، مثنویات و رباعیات (و ص) خصوصیاتِ کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقید و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے۔ قیمت :- چار روپے

مینیجر ننگار پاکستان \* ۳۲ \* گارڈن مارکٹ \* برکراچی ۳



جولائی ۱۹۶۴ء



مدیر اعلیٰ  
نیاز فتحپوری

نائب مدیران

عارف نیازی

فرمان فتحپوری

قیمت فی پرچہ  
۷۵ پیسے



زمرہ سالانہ  
دش روپے

نگار پاکستان - ہند گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

ظور شدہ برائے مدارس کراچی .. بموجب سرکل نمبر ڈی/ایف یو پی - بی ۳۶۶۹ - ۶۸ محکمہ تعلیم کراچی  
شریف پبلشر عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ سے شائع کیا۔ - کتابت - عالم علی خاں



## فہرست

ماہنامہ

نگار

پاکستان

کراچی

جولائی ۱۹۶۴ء

۴۴ سال ..... فہرست مضامین جولائی ۱۹۶۴ء ..... شمارہ (۷)

|                                          |                               |              |
|------------------------------------------|-------------------------------|--------------|
| ملاحظات                                  | جواہر لال - لال بہادر         | نیاز فتحپوری |
| نیاز نمبر کے بعد                         | سید علی اکبر کاظمی            |              |
| قلق میرٹھی                               | سید محمد فاروق                |              |
| چند داستان کی کرنسی اور عہد مغلیہ کے سکے | نیاز فتحپوری                  |              |
| فراق کی شاعری خود ان کی زبانی            | فراق گورکھپوری                |              |
| تاریخ اٹلی کا ایک انتہائی حیرت ناک واقعہ | نیاز فتحپوری                  |              |
| سودا کے قصائد و ہجویات                   | عبد الجلیل بھٹی               |              |
| لکھنؤ مرحوم                              | نیاز فتحپوری                  |              |
| نوا اور غالب                             | نثار احمد فاروقی              |              |
| دنیا کے دولایخیل معے                     | نیاز فتحپوری                  |              |
| تذکروں کی روایت بیسویں صدی میں           | ملک محمد اسماعیل حسن خاں      |              |
| اقبال اور ملا                            | اقبال                         |              |
| عہد حاضر کا ایک مفکر اعظم                | سروش                          |              |
| باب المراسلہ                             | (۱) اصلاح معاشرہ - نظیر صدیقی |              |
|                                          | (۲) حیرت و نیاز               |              |
| باب الاستفسار                            | حافظ کے دو شعر                | نیاز فتحپوری |
| منظومات                                  | فضا ابن فیضی                  | طالب جے پوری |
|                                          | شارق میرٹھی                   |              |



# ملاحظات

## جواہر لال — لال بہادر

اس دوران میں دنیا ایک بڑے سانحہ سے دوچار ہوئی۔ اور وہ سانحہ جواہر لال نہرو کی موت کا تھا۔ یہ خبر سن کر مجھے نظامی کے سکندرنامہ کا ایک شعر یاد آگیا، دارا زخمی ہو کر گھوڑے سے گر جاتا ہے اور سکندر پہنچتا ہے کہ زمین سے اٹھا کر اس کا سراپہ زانو پر رکھے۔ لیکن دارا دشمن کے اس سلوک کو گوارا نہیں کرتا اور سکندر سے کہتا ہے، "مجنباں مرا تانہ جبہ زمین" مجھے جنبش نہ دو ورنہ زمین جنبش میں آجائے گی۔

تو خیر ایک شاعرانہ انداز بیان تھا نظامی کا۔ لیکن جواہر لال نہرو کی موت نے واقعی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور دسے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں اس حادثہ عظیم پر اظہارِ افسوس نہ کیا گیا ہو۔

کرہ ارض کی اربوں آبادی میں سے ایک کیا لاکھوں افراد روزِ فناء ہوتے رہتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی فرد کی موت کروڑوں افراد کو بیتاب کر دیتی ہے اور زمانہ کے ایسے ہی مہتمم بالشان افراد میں سے ایک فرد "جواہر لال نہرو" بھی تھے۔ جن کے جسم کی راکھ بھی اب باقی نہیں رہی۔ لیکن اس کی شخصیت کبھی فنا نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کی شخصیت ایک عہدِ آفریں شخصیت تھی۔ جو صفحاتِ تاریخ پر اپنے بہت سے نقوش چھوڑ گئی ہے اور ان نقوش کو کبھی محو نہیں کیا جاسکتا۔

نہرو کی عظمت کا تعلق دراصل اس سے نہیں کہ وہ حکومتِ ہند کے وزیرِ اعظم تھے اور بڑی آن بان سے وزارت کر گئے بلکہ اس کا تعلق دراصل، نہرو کی انسانیت اور اس کی بلندیِ اخلاق و کردار سے ہے جو مرتبہ وزارت سے زیادہ اونچی چیز تھی۔ اتنی اونچی کہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ اپنی وزارت کو بھی اس سطح تک نہ لاسکا، تو میرا یہ کہنا بالاعلانہ ہوگا۔ وہ بظاہر ایک جمہوری حکومت کا وزیرِ اعظم ضرور تھا، لیکن وہ دراصل گھرا ہوا تھا اُن افراد میں جو جمہوریت کے صحیح مفہوم سے نا آشنا تھے اور اسی لیے وہ ہندوستان کی مفروضہ لادینی حکومت کو سوشلسٹ میں تبدیل کر دینا چاہتا تھا تاکہ وہ حکومت کو صحیح معنی میں مذہب سے جدا کر دے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ ہم کروڑوں افراد کی اس تاریک ذہنیت کو جو ہزاروں سال سے نسلاً بعد نسل منتقل ہو چلی آ رہی تھی۔ دور کرنا آسان بات نہ تھی اگر نہرو سو سال اور زندہ رہتا تو کبھی وہ ہندوستان کی ہندو آبادی کی اس تنگ و تاریک ذہنیت کو دور کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔

جب وہ دیکھتا تھا کہ حکومتِ ہند کا پریذیڈنٹ بھی ہندوؤں کے پاؤں اپنے ہاتھ سے دھونا اپنے لیے باعثِ نجات



سمجھتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ تربیتی پر اشنان کرنے کی کشمکش میں ایک بڑے سے بڑا ہندو مفکر بھی جان تک دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ دیویوں اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کیلئے ہزاروں لاکھ جانوروں کا خون بہانا ہندو تہذیب کا جزو اعظم ہے، جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ حکومت کے ایوان میں بھی، دیہ کے منتر اور کائتری کے ورد پر اصرار کیا جاتا ہے۔ تو وہ بیتاب ہو جاتا تھا اور خون کے سے گھونٹ پی کر رہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی پست ذہنیت رکھنے والی پست جمہوریت کی وزارت عظمیٰ، نہرو کی وسیع ذہنیت رکھنے والے انسان کے لئے بہت فرد تہ چیز تھی اور اس لئے وہ ہمیشہ اسی کوفت میں مبتلا رہا کیونکہ اسے اپنی سطح پر لے آئے اور بار بار انھیں لمحات نامرادی میں ابے مجبوراً بعض سیاسی لغزشوں میں بھی ہونا پڑا۔ اور یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ نہرو کی سی جامع و حسین شخصیت کی جانشینی کا مسئلہ بڑا مشکل مسئلہ تھا اور ہندوستان میں یقیناً کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو صحیح معنی میں نہرو کا جانشین ہو سکے۔ لیکن جگہ کا پر کرنا تو بہر حال ضروری اس لئے لال بہادر شاستری کا انتخاب عمل میں آیا۔ جن کے نام کا پہلا لفظ وہی ہے جو نہرو کے نام کا آخری ٹکڑا۔ شاستری جی کی پچھلی زندگی بڑی صاف، سادہ، صلح کل اور یکسر سعی و عمل رہی ہے۔ آزادی ہند کے لئے وہ بھی سخت استقامت و آزمائش کے دور سے گزر چکے ہیں اس لئے یہ انتخاب برا نہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انھیں چین سے کرنے دیا گیا تو ممکن ہے وہ نہرو کے بعض تمناؤں کو پورا کر سکیں لیکن بعض ایسے تباہ کن عناصر جن کے خلاف نہرو کوئی جرات مندانہ اقدام نہ کر سکے تھے۔ اب بھی بدستور موجود ہیں اور ممکن ہے کہ نہرو کے بعد وہ اور زیادہ سر اٹھا اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ شاستری جی کو آئندہ کن دشوار گزار منزلوں سے گزرنا ہے۔ اور وہ کس حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔ تاہم ان کی طبعی نیک مزاجی سے امیدیں ضرور وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ اگر کسی ملک کا وزیر اعظم ہونے کے لئے اس کا محض نیک ہونا کافی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے تعلقات تقسیم ہند کے بعد ہی بے ناخوشگوار چلے آئے ہیں جن کا بڑا سبب مسئلہ کشمیر ہے لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جب سولہ سال کی کشمکش اور تلخی کے بعد شیخ عبداللہ کی کوشش سے دونوں میں باہمی مفاہمت کی صورت پیدا ہوئی تو نہرو چل بسے اور جس رفتار سے یہ کارروائی آگے بڑھ رہی تھی، وہ اگر ختم نہیں ہوئی تو اس کا پتہ پڑ جانا یقینی ہے۔

گو شیخ عبداللہ اب بھی مایوس نہیں ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ لال بہادر شاستری ضرور ان مقاصد کو پورا کریں گے جو نہرو کے پس منظر پر انھیں ہیں۔ ایک قضیہ کشمیر بھی تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نہرو کی زندگی ہی میں کب اس گتھی کے سلجھنے کا یقین کیا جاسکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور کہ دور مایوسی ایک حد تک ختم ہو گیا تھا اور اگر شاستری جی بھی اسی فضا کو قائم رکھ سکے اور ان کی کوشش سے کوئی صورت ہندوستان و پاکستان کی باہمی مفاہمت کی پیدا ہوگئی تو یہ ان کے عہد وزارت کا اتنا بڑا کارنامہ ہوگا کہ ساری دنیا انھیں مستحق مبارکباد قرار دے گی۔

اسی طرح ایک دوسرا نہایت اہم مسئلہ بھارت کی اندرونی سیاست کا وہ ہے جو ہندو مسلم تعلقات سے وابستہ ہے اور خوشی کی ہے کہ شاستری جی نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں اس کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ بہر حال بھارت کی نئی وزارت کی طرف سے اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ مایوس کن نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں بھارت و پاکستان ایک دوسرے سے زیادہ قریب آجائیں اور وہ کشمکش جو دونوں ہمسایہ ملکوں کے لئے درد سببی ہوئی ہے، کچھ لمبی ہو جائے اور رفتہ رفتہ تعلقات زیادہ خوشگوار ہو جائیں۔



# نیاز نمبر حصہ اول و دوم کے بعد

سید علی اکبر کاظمی

(ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے) اور اگر کوئی ایسی ہی خواہش پر کسی کا دم نکلتا ہو۔ پوری ہو جائے تو انبساطِ قلبیت کی حشر سامانیوں کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہے۔ نیاز نمبر حصہ اول میرے ہاتھوں میں آیا تو کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ جذبات میں ہیجان و تلاطم کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے میں عالم از خود رفتگی میں پہنچ گیا۔ یہ شاعری نہیں حقیقت ہے۔ عرض کروں کہ نیاز مند بننے میں کافی محتاط ہوں اور اپنے قلب و دماغ کا سودا کرنے میں کافی گرانفروشی بھی۔ آسانی سے کسی کا حلقہ ارادت کلوگیر کرنے پر کبھی رضا مند نہیں ہوتا لیکن اس عظیم انسان (نیاز فچیوری) کے کردار کی عظمت نے کس طرح مہ جبتہ مجھے حلقہ بگوش بنایا اور کس طرح رفتہ رفتہ نیاز صاحب سے عقیدت میرے رگ و ریشہ میں پیوست ہوتی گئی، یہی کی روئداد سنانے کے لئے آج قلم اٹھایا ہے لیکن ساتھ ہی اپنی تہی مالگی اور کاہلی کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ کیوں نہ وقت اپنے غیر مربوط خیالات قلمبند کر کے نیاز نمبر میں شرکت کی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ادارہ نگار نے جن اہل قلم کو نیاز نمبر شریک ہونے کے لئے متوجہ کیا تھا اس میں میرا نام غالباً اس سبب سے نہیں تھا کہ فرمان صاحب فچیوری کو کیا خبر تھی کہ زمانہ ام بھوپال میں نیاز صاحب نے ایک نیاز مند بھی بنایا تھا اور اس طرح میں "من گفتگو کے می کنم" کا مصداق بنتا۔ دوسرا یہ سبب یہ تھا کہ نیاز صاحب پر جب کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو عربی کا مصرعہ "مرغ اوصاف تواز اوج بیاں انداختہ" ذہن میں اپنی بازو شکستگی اور نالوائی کا احساس ہونے لگا اور میں نے سوچا کہ شاید کوئی "نیازی" حصہ دوم میں نیاز صاحب کی شخصیت و عظمت کو دار پر اظہار خیال کر دے اور یہ ضرورت پوری ہو جانے کے بعد مجھے اپنے بکلبہ کاہلی سے باہر آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ سن دونوں حصوں کی سیر حاصل سیر کے بعد بھی میرے تجسس کی تسکین نہ ہوئی اور میرا دماغ "ہبل من مزید" کی رٹ مارتا رہا۔ بزم نیاز نمبر میں جن حضرات نے حاضری دی ہے ان کے پیش نظر نیاز صاحب کے رشحاتِ قلم کے اتنا رکتھے اور ان حضرات نے انھیں پر طبع آزمائی کی اور کرنی بھی چاہئے تھی۔ فرمان صاحب کی تحریک پر جس طرح برصغیر کے ہر گوشہ سے میل فرصت میں مضامین کی بارش ہوئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اہل قلم "منتظر ہو" بیٹھے ہیں اور مضامین اس طرح بے ساختہ سپرد قلم کئے گئے جیسے کسی نے محفلِ حال و قال میں بیخود ہو کر ایک نعرہ لگا دیا ہو۔ لیکن ان لوگوں کو دیکھنے کے بعد بھی مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ہر شے میں کچھ کمی پاتا ہوں میں "جی چاہتا تھا کہ کوئی صاحب از صاحب کی بنی زندگی کے اندر جھانک کر دیکھیں اور بیرون در والوں سے سرگوشی کے انداز میں ہی سہی۔ سب کچھ بتا دیں اور ان بات پس بددہ نہ رہے میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بے شمار رنگا ہیں اس جستجو میں ان کی طرف لگی ہیں کہ جمالیات پر ہوشگافیا



کرنے والا یہ ادیب خود کس عالم میں ہے؟ ذرا دیکھیں تو ہی کہ اپنے سحر آگین نعموں سے دنیا کو بیدار اور بچھین کر دینے والا خود مجھو خواہ رخت ہے یا کر دیش بدل رہا ہے۔ مگر کوئی دانائے راز میدان میں نہ آیا اور نجی زندگی کے سرلبستہ راز پردہ خفایں ہی رہے۔ میرا جہاں تک تعلق ہے میں عجیب کشمکش میں ہوں۔ ایک طرف احساس کمتری جہر سکوت توڑنے پر آمادہ ہونے نہیں دیتا دوسری طرف کتمان حقیقت کی معصیت جہنم چھوڑ رہی ہے کہ تو بہ کا دروازہ کھلا ہے۔ جی میں آیا کہ نیاز صاحب کے کردار کی جزئیات جو سا لہا سال تک دماغ میں محفوظ کرتا رہا ہوں بر ملا کہہ دوں لہذا میرے طبعی جہود میں حرکت پیدا ہوتی ہے ناچار آمادہ گفتار ہونا پڑا ہے۔ خیر یہ سب تو اپنے اپنے محل پر زیر بحث آئے گا میں تو نیاز نمبر حصہ اول کے اپنے ہاتھوں آنے کی بات کر یا تھا۔ میں فرمان صاحب فتنچوری کا یہ کارنامہ خیال کرتا ہوں کہ انھوں نے نیاز نمبر شائع کرنے پر نیاز صاحب کو خانہ کر کے نیم رضا کے پہلو نکال لئے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ ادبی دنیا کی یہ رسم قدیم سے چلی آرہی ہے کہ فن کار ادیب کی زندگی میں خاص نمبر شائع نہیں کیا جاتا اور جوش عقیدت میں فن کار اور ادیب کی موت کا بھینپنی سے انتظار کیا جاتا جاتا ہے کہ برصغیر ہندوپاک کی سرشت جذبہ شاہیر پرستی سے خیمہ ہوئی ہے اور ممکن ہے یہ صحیح بھی ہو مگر میں اتنا اضا کروں گا کہ یہ برصغیر مردہ شاہیر پرستی کا خوگر ہے اور ایسا خوگر کہ زندہ فن کار کو حسرت سے دیکھتا ہے کہ کب ان کو آئے اور کب عزتی جلسے ہوں۔ یادگار محفل مشاعرہ منعقد ہو۔ اظہار غم کے ریزولوشن منظور ہوں۔ یوم منائے جائیں برسی قائم کی جائے اور موقع ہو تو عرس قائم کر کے سرسزار ڈھولک بجائی جائے!۔ کبھی کبھی تو میں خود کچھ خوش الحان قوال سننے کے لپچ میں محفل حال و حال میں جادو کا ہوتا اور جبہ و دستار میں وجدانی جنبشوں کے حیرت انگیز مناظر دیکھتے مقدس علماء کے گریہ باختیار (بے اختیار نہیں) کا منتظر۔ اللہ اکبر صریحی عماموں کے سایہ میں سرگیں آنکھوں سے اشک اُمٹ کر خضاب زدہ حنائی ریش میں اس طرح جذب ہو رہا ہے جیسے قطار پرشکال خزاں رسیدہ گیاہ میں۔ کبھی ہوا ہے کہ حال لانے کے آرٹ کی ٹیکنک پر غور کر کے میں نے بھی وجد میں آنے کی ناکام کوشش کی ہے اور اس وقت نڈھال رہا ہوں جب تک کوئی مجذوب مجنونانہ انداز میں مجھ سے بغلیگر ہونے کے لئے بیتا بانہ نہیں بڑھا ہے! بہر میں شاہیر کی موت کے بعد قدر آخرائی کی تصویریں۔ غضب خدا کا علامہ اقبال کے تخلیقی ادب کے انبار ناقدر را کی سردھری کے نذر ہو گئے اور آخر عمر میں علامہ کو مرحوم نواب صاحب بھوپال کے دامن عاطفت و عافیت میں پناہ مجبور ہونا پڑا۔ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا تھا کہ ادارہ افکار نے بدعت حسنہ یا سید کا ارتکاب کر کے جوش صاحب کی زندہ جوش نمبر نکالا ہے اور سچ پوچھئے تو یہ شبہ سا ہوا (ادارہ افکار سے معذرت کے ساتھ!) کہ ادارہ افکار نے کہیں اس کے تحت خاص نمبر تو نہیں نکالا کہ جوش صاحب جب جیے ہی جا رہے ہیں تو انکی متزایہ ہو کہ زندگی ہی میں جوش نمبر نکال د (خدا تادیر جوش صاحب کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے) نیاز صاحب کے سلسلے میں تو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا دیرینہ رسم و رواج سے مرعوب ہو کر کوئی رعایت ملحوظ رکھیں گے۔ برصغیر کی تاریخ میں ایک بت شکن محمود غزنوی کی یاد اور حاضر میں روایات شکن نیاز صاحب مراسم شکنی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ محمود غزنوی کی بت شکنی تو محمود فنا ہو گئی لیکن نیاز صاحب کی روایات شکنی کے اثرات جوں جوں نہایت گزرے گا مضبوط تر ہوتے جائیں گے۔ میری آنکھ دیکھ رہی ہیں کہ ارکان اسلام پر دور جدید کے ناروا حملوں کی دفاع کے لئے انہی کے نتائج افکار مثل من و یزدان گردانی کھڑے کی۔ اور یہیں وہ جائے پناہ میسر آئے گی جہاں اسلام دشمن جریوں کی شدت سے مسلم قوم محفوظ رہے گا۔



ہے گی۔ نیاز جیسے بالغ النظر انسان سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ادبی شخصیات نمبر شائع کرنے کی افادیت و حقیقت کار و ادیب کی زندگی ہی میں ہے۔ اگر کچھ خامیاں زیر بحث آگئیں تو ان کی اصلاح ہوگئی اور خوبیوں کا اعتراف ہوا تو ادیب حوصلہ افزائی کا سبب ہوا۔ ورنہ "بعد از سر من کن فیکوں شد شدہ باشد" سے کیا نتیجہ۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیاز حب نے فرمان صاحب فتحپوری کے اس خیالی اختلاف کیوں کیا تھا کہ نیاز نمبر نکالا جائے۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس میں دمنائی کا ثابہ سا پایا جاتا تھا اور خود دمنائی سے نیاز صاحب اس طرح بد مزہ ہوتے ہیں جیسے ان کے منہ میں کوئی کڑوی رکھ دی گئی ہو یا اس طرح بدکتے اور چونک پڑتے ہیں جیسے راہ چلتے سیاہ ناگ پیروں میں آگیا ہو۔ جن صاحبان نے نیاز صاحب کو کیو پڈ و سائیکلی۔ گیتان جلی۔ جذبات بھاشا۔ نگارستان اور من ویرداں کے مصنف و مولف کی حیثیت سے سزیمگار کی حیثیت سے دیکھا اور نیاز نمبر میں قلمی شرکت کی ہے ان سے میرا راستہ ذرا ہٹ کر دوسری سمت میں جاتا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ اس سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا چلوں۔ دچپاہوں کہ جو منزل میں نے متعین کی ہے بھٹک کر کہیں اس سے دور ہو جاؤں " ورنہ کیا بات کہہ نہیں آتی " مجھے خوب یاد ہے کہ پہلی مرتبہ جب کیو پڈ و سائیکلی یا "ایک رقاصہ سے" کا مطالعہ کرنے کیا ہے تو بخودی و محویت کی ایسی کیفیت طاری ہوئی تھی کہ جی چاہنے کے باوجود دل مقام لینے کا ہوش بھی نہیں رہا اور ہر ہر سطر پر عالم یہ تھا کہ "..... میرے لیے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں " شایر میں طبعاً کچھ زیادہ جذباتی واقع ہوا ہوں نیاز صاحب کے ادب پاروں کا یہ یک نشست مطالعہ کرنے میں جذبات کی فراوانی و برانگیختگی ہمیشہ دامنگیر ہوئی۔ اور سانس میں پڑھ لینے والے پر ہمیشہ تعجب ہوا کہ کیا کلیجہ ہے تماشائی کا " نگار جب کبھی میرے پاس پہنچتا تو بیتابی کے ساتھ ادب و محبت مضامین پر نظر ڈالتا کہ نیاز صاحب کا نام کتنی جگہ درج ہے اور اگر آپ مبالغہ نہ سمجھیں تو یہ حقیقت بھی بتا دوں کہ لفظ "نیاز" جواہرات کی طرح جگمگاتا معلوم ہوتا ورنہ یہ تسکین تو ہمیشہ رہی کہ "ملاحظات۔ استفسارات و جوابات۔ مالہ و ماعلیہ اور لمبوعات موصولہ کے عنوانات پر تو نیاز صاحب کے نتائج افکار دیکھنے کا موقع مل ہی جائے گا۔ ملاحظات کے مضامین کا تنوع و ہمہ گیری خدا کی پناہ اس میں ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی " معلوم ہوتی۔ استفسارات و جوابات کا یہ عالم کہ جو چاہو پوچھو دلائل اور ثبوتی جواب مل جائے گا۔ نگار کی یہی خصوصیات تو ہیں جنہوں نے نگار کے مقام کا تعین دیگر تمام ادبی ماہناموں سے برتر کیا ہے۔ آپ قدیم زمانے سے لے کر موجودہ وقت تک تمام ماہنامہ رسائل پر نظر ڈال لیجئے نگار کی جامعیت آپ کو کہیں سے ملے گی۔ آپ روزانہ دیکھتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے جب تیز روشنی آجاتی ہے تو تمام ماحول نگاہ سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اس تیز روشنی کے سوا کسی اور چیز کے دیکھنے کی صلاحیت ہی آنکھوں میں باقی نہیں رہتی۔ یہی حال نیاز صاحب کے طرز استدلال و در بیان کا ہے کہ اس سے بہت کرکچر اور سوچنے کی دماغ میں سکت ہی نہیں رہتی۔ لیکن جس طرح تیز روشنی گزر جلنے کے تھوڑی دیر بعد دل کا جغرافیہ رفتہ رفتہ ابھرتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کوئی مقام جیسا روشنی میں نظر آیا تھا ویسا تو نہیں یوں ہے۔ کبھی کبھی یہ ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے اور مجھے من ویرداں کے بعض مقامات سے اختلاف بھی ہوا ہے یا انتقادات کے ذیل میں ہی شوخ چٹمی کی جسارت کرنے کو بھی جی چاہا ہے لیکن اس سلسلہ بیان میں بطور مثال بھی اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ اس کو چھوڑ کر نیاز صاحب کے کردار پر لکھنا ہے جس کو میں لفظ عظیم کے بغیر بھی نہیں بولتا۔ میرے تجربات نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں کم کردار ہی کہوں اور یہ میری وہ رائے ہے جو میں نے نیاز صاحب کے ہر شعبہ پر برسوں کا قدانہ نظر و الکراں کے کردار کی آزمائش و ناپ تول کے نت نئے اہتمام کرنے کے بعد قائم کی ہے۔ میرے سوا غالباً نہ کسی کو نیاز صاحب سے اتنی قربت رہی ہے



ان کے اخلاق کے ہر پہلو پر نظر ڈالنے کا اتنا موقع ملا ہے۔ لیکن اس مشکل مرحلہ کو آسان بنانے کے لئے اور افہام و تفہیم کی منہ تک پہنچنے کے لئے کچھ تمہید کی ضرورت ہوگی اور نفسیات کا سہارا لینا پڑے گا۔ اچھائیوں سمجھئے کہ انسان کے تمام حواس ظاہری باطنی درجہ اعتدال پر قائم نہ ہیں اور ان میں کم یا زیادہ ہونے کا شائبہ نہ رہے تو اس شخص میں نتیجہ ایک جس خود بخود پیدا ہو جسے جس مشترک یا عام سنس 'Common sense' کہتے ہیں اور جس کو اصابت رائے بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا مفہوم جس مشترک جو احساسات کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر تہذیب نفس کے تمام شعبے کسی شخص میں حد کمال تک راسخ ہو جائیں تو میرے خیال میں (اس میں ایک تہذیب مشترک، بھی خود بخود مرکوز ہو جاتی ہے اور کبھی اس کو دائرہ تہذیب سے باہر نہیں ہونے دیتی اور اس کے کی محافظ بن جاتی ہے۔ نیاز صاحب کے اقتاد طبع میں یہی تہذیب مشترک کا رفرما ہے اور ان کو شائستگی نفس سے کبھی کنار ہونے کی اجازت نہیں دیتی اور وہ کبھی جادہ تہذیب سے تجاوز نہیں کرتے نیاز نمبر کے دونوں حصے دیکھنے سے مجھے محسوس ہوا کہ ان میں کچھ گفتنی باتیں رہ گئی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان گفتنی باتوں کی تفصیل میں جانے کے لئے ایک ناگفتنی بات کہنے پر مجبور ہو رہا ہوں جس کے بغیر نیاز کو میں برا فگندہ نقاب پیش کرنے سے معذور ہوں گا اور میری تمام نگارشات یادہ گوئی رہ جائیں گی۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ بھوپال میں مجھے ایک صاحب نے کہا کہ فلاں آزاد خیال اور مغرب زدہ خاندان کے حصہ (صنف نازک) تک رسائی دشوار نہیں ہے بشرطیکہ اخفا کی طرف سے اطمینان دلادیا جائے اور مخصوص ماحول پیدا کیا جائے۔ میں نے تعجب سے سنا اور ان صاحب کو نیاز صاحب کی خدمت میں بھیج دیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ لسانی اور چرب زبانی کے دکھانے کا موقع بھی یہی ہے۔ وہ صاحب اثر اندازی کے پندار اور تھرلین و ترغیب کی ناک فگنی و قدر اندازی کے سے مسلح ہو کر علامہ نیاز کے خلوت کدہ کی طرف روانہ ہوئے اور میں تبسم زیر لب اور خندہ دندان نما کی درمیانی کیفیت ہوئے ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کھوڑی ویر بعد واپس تشریف لائے لیکن ناسکامیاب و مضحک اور سرگوشی کے میں یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ نیاز کو حریم ناز میں بھیجنا آسان نہیں وہ آمادہ نہیں ہوئے۔ دیکھا آپ نے حسن کی جلوہ پاشیوں۔ دنیا کو منور کر دینے والا یہ ادیب صاف دامن بچا گیا۔ اور بات صرف اتنی تھی کہ اخفا کی طرف سے اطمینان دہانی کی شرط کی تہذیب مشترک، کو گوارا نہ ہوئی حقیقت یہ ہے کہ جمالیاتی احساس طوفان کی صورت میں نیاز صاحب کے قلب و دماغ فطرت نے بھر دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس صلاحیت کا حصہ وافر بھی ان میں ودایت کیا ہے کہ ہر عمل سے پہلے وہ تہذیب اخلاق کے تمام شعبوں کو جھنجھوڑ کر اور گھنگال کر دیکھ لیں کہ اس صورت میں اصول اخلاق کی خلاف ورزی تو نہیں اس لئے وہ کبھی اخلاق کی بلندی سے نیچے نہیں اترتے۔ نیاز صاحب کبھی اسی گوشہ پورست سے مرکب ہیں اور جذبات سے ان کا سینہ شق ہوا جاتا ہے لیکن ہمیشہ تہذیب نفس آرٹ سے آتی ہے اور وہ کبھی جادہ شرافت تجاوز نہیں کرتے۔ گویا تڑپنا۔ بیتاب ہونا اور محروم رہنا ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے اور بجز اس کے کہ وہ ناگردہ کی حسرت اور ناآسودہ تمناؤں کے کرب میں زندگی بسر کریں۔ ان کے لئے کوئی راہ فرار نہیں ہے میرا خیال یہ ہے کہ نیاز صاحب خود کبھی اس سے واقف نہیں ہیں کہ محرومیوں اور نا کامیوں کا سرچشمہ خود ان کی ذات میں پوشیدہ علامہ اقبال کی اس اجازت سے بھی استفادہ نہیں کرتے کہ "لیکن کبھی کبھی بسے تنہا بھی چھوڑ دے" اور وہ پاسبان کو ہمیشہ دل کے پاس رکھتے ہیں۔ ان کو "کبھی کبھی" بھی خارج از عقل ہونا گوارا نہیں ہوتا۔ غالباً ان کا نظر یہ ہے کہ



نسان ہی کیا جو ایک لمحہ کے بھی عقل کو خیر باد کہہ کر دل کو من مانی کے لئے تنہا چھوڑ دے۔ نیاز صاحب میں تہذیب مشترک کی موجودگی کا بابت جو کچھ میں نے لکھا ہے معلوم نہیں اس سے اپنے مفہوم کو واضح اور قابل فہم بنا سکا ہوں یا نہیں؟ مگر اتنا یقین ہے کہ مارٹن کو میرے مقصد کا کچھ نہ کچھ آندھا (idea) ضرور ہو گیا ہوگا۔ اچھا اسی روشنی میں نیاز صاحب کے اس خط کے چند جملوں پر غور کیجئے جو انھوں نے اچھے گڈھ چھوڑنے کے بعد کسی کو لکھا ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ غرض کہ مکتوب الیہ دن تھا بس اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز صاحب کے اچھے گڈھ چھوڑنے کے بعد مکتوب الیہ پر بھی ایسا شدید جذبہ طاری ہوا کہ میں نے بھی اچھے گڈھ کو خیر باد کہہ دیا اور ایک قاصد کے ذریعہ اپنی آمد کی خبر جب نیاز صاحب کو کی ہے تو مکتوب الیہ کے اشارے یا اعتراضات ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ "اتھ بڑی قربانی اور میرے لئے اللہ اللہ" مشورہ یہی دیا کہ زلیخا کو پردہ عصمت میں واپس بٹانا چاہئے اور محاسبہ کرنے والوں کو بھیج کر بگڑ گئے سہی آنسو بہا کر راضی کر لیں۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا ایک مصرعہ کچھ تصرف کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرتا ہے کہ "گفتار کے یہ غازی تو بنے کردار کے غازی بن نہ سکے" نیاز نمبر حصہ اول کے ایک فاضل مضمون نگار نے نیاز صاحب کے طویل افسانہ یا ناولٹ "شہاب کی سرگزشت" کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ "مجھے نیاز صاحب کے کردار شہاب اور آسکر وائلڈ کے کردار ڈورین گرے سے جتنی نفرت ہے اتنی نفرت میں آج تک کسی اور سے نہ سیکھا۔ خدا کرے شہاب کے پردہ میں کہیں نیاز صاحب نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو مجھے یقین ہے کہ شہاب کے فلسفہ حیات بخود انھوں نے ہی عمل نہ کیا ہوگا۔" مجھے بھی فاضل مضمون نگار کی رائے سے اتفاق ہے اور تیس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے جب یہ فسانہ پڑھا تو یہ محسوس کیا تھا کہ جیسے کسی پاکیزہ اور معطر شے کے غلاف تحت میں ڈبو دیا ہو۔ مگر میں اب یوں سوچنے لگا ہوں کہ ہمیں اپنے ذوق کے معیار پر ہر چیز کو پرکھنا اور تولنا مناسب نہیں۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو شہاب کے کردار میں ایسی ہندی ہے جس کا نظارہ پستی میں کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتا۔ شہاب کے کردار سے محبت کر نیوالے بھی موجود ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے نقطہ نظر سے واقف ہو کر وہ کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ "در بلغ لالہ روید و در شورہ بوم خس"۔ یہ اطلاع بھی دیدوں گی ہاں شہاب کے پردے میں نیاز صاحب ہی ہیں اور اس کے فلسفہ حیات پر نیاز صاحب نے عمل بھی کیا ہے جس کا ذکر مان صاحب نے 'نیاز نمبر حصہ اول' کے ابتدائی اوراق میں کیا ہے کہ ایک شادی نیاز صاحب نے بیوہ ہی سے کی ہے۔ زمین ممکن ہے کہ بہت سی قدر دان اور ادب نواز ناکتھڑا لڑکیوں کو مایوس بھی کیا ہو نیاز صاحب کی عملی زندگی میں انسانیت و شفقت نفس۔ اخلاق اور ذہانت نے تبحر علمی سے جل کر ایک حسن اور ایک بلندی پیدا کر دی ہے جو ان کی زندگی کے شعبہ میں کا فر مانظر آتی ہے۔ ان کے کردار سے جو عظمت مترشح ہوتی ہے اس کی جزئیات تک میں نے اپنے ذہن میں محفوظ و محفوظ رکھی ہیں۔ جی چاہتا ہے ان جزئیات کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے قلم کو آزاد چھوڑ دوں اور لکھتا ہی چلا جاؤں لیکن دل خواستہ بخوف طوالت ان کو نظر انداز کر کے اہم واقعات کو مقدم کرتا ہوں۔ نیاز نمبر میں حصہ لینے والوں نے نگار کے صبر آزما اور سخت دور کا اجمالاً ذکر کیا بھی ہے جبکہ علمائے سنو نے نیاز صاحب پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی جدوجہد بھی میں اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ کا اضافہ کروں گا جس سے واضح ہوگا کہ نیاز صاحب کی اینداز سانی میں کتنا اہتمام کیا گیا، نئے وسیع ذرائع استعمال کئے گئے، کہ ان کہان محاذ قائم کیا گیا اور کس کس کی نگاہ سے ان پر تیر اندازی کی گئی (اس کا تذکرہ میں نے نیاز صاحب سے کبھی نہیں کیا)۔ غالباً ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے کہ میں بھوپال میں سکریٹریٹ صحت عامہ و تعلیمات (ہم سکریٹریٹ) کا سپرنٹنڈنٹ تھا اور صاحبزادہ سعید المنظر خان صاحب مرحوم جو میڈیکل کالج لکھنؤ کی پرنسپل سے ریٹائر ہو کر



سے پاس سو دجا پڑا یا برا بھلا یا برا۔ ایسے سربہ بے یا دوسرا یا یہاں (اور دوسرا) برا بھلا یا برا۔  
 اور اس وقت بھوپال کے پولیٹیکل ایجنٹ کی قائم مقامی کر رہے تھے۔ منسٹر صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے  
 جس پر جلی حروف میں کانفیڈنشل (Confidential) لکھا تھا اور گورنمنٹ ہند کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ  
 ہنر ہانس بھوپال کو بھیجا گیا تھا منسٹر صاحب کے ہاتھ میں تھا جو میرے سپرد کیا گیا اور ہدایت فرمائی گئی کہ اس معا  
 (Mr Newman) دائرہ کٹر تعلیمات سے متبادلہ خیال کر کے کہ کیا کاروائی مناسب ہوگی جلد تجویز پیش کی جا  
 عبارت تو مجھے یاد نہیں رہی لیکن مفہوم بالکل یہی تھا ..... - "گورنمنٹ ہند کی توجہ اس طرف نہ  
 ہے کہ لکھنؤ کا ایک ماہنامہ نگار ایسے دل آزار مضامین شائع کرتا ہے جس سے مسلم عوام کے جذبات مجروح ہوئے  
 دل میں منافرت کی تحریری ہوتی ہے۔ لہذا سربراہ اور وہ مسلم افراد نے استدعا کی ہے کہ ماہنامہ نگار کی اشاعت  
 اور ادارہ نگار پر کاری ضرب لگائی جائے تاکہ گورنمنٹ کی مسلمان رعایا اس کی دل بھڑائی سے محفوظ ہو۔ گورنمنٹ  
 ہے کہ اس معاملہ میں بھوپال گورنمنٹ تعاون کرے گی اور حدود ریاست میں نگار کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے گا  
 ہی نے یہ مشورہ بھی منسٹر صاحب کو دیا ہوگا کہ یہ مسئلہ علمی اور ادبی ماہنامہ سے متعلق ہے لہذا مسٹر نیو مین ڈائری  
 سپرد کیا جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ درپردہ کرنل سمن کی یہ ذہنیت کارفرما تھی کہ گورنمنٹ ہند کی مشکلات دو  
 ایک انگریز افسر بھی زیادہ توجہ اور جوش سے کام لے گا۔ اور ہوا بھی یہی کہ پندرہ بیس منٹ کے اندر مسٹر نیو مین  
 دفتر میں تشریف لے آئے اور فرمانے لگے کہ منسٹر صاحب نے ذریعہ ٹیلیفون طلب کر کے مجھے ہدایت کی ہے کہ پول  
 گورنمنٹ ہند کے کانفیڈنشل لفافہ پر غور کر کے جلد اپنی تجویز پیش کر دوں۔ میں نے مسٹر نیو مین سے کہا کہ لفافہ  
 لیکن اس سلسلے میں مجھے مفصل گفتگو کرنی ہے دفتر میں تو موقع نہیں میں آج شام کے وقت بنگلہ پر حاضر ہو جا  
 نیو مین جو میرے بے تکلف دوست تھے اور میں ان کے نام کا اردو میں ترجمہ کر کے ان کو "نیا آدمی" کہا کرتا تھا  
 اس کی پذیرائی کرتے تھے خود انگلش لٹریچر کے ادیب و شاعر تھے۔ بھوپال انیتھم (Anthem) یعنی ترانہ پر  
 بڑی پاکیزہ نظم انگریزی میں منسٹر صاحب کو پیش کی تھی جو منسٹر صاحب نے اصلاحی نظر ڈالنے کے لئے مسز نانڈ  
 تھی لیکن مسز نانڈ نے اس کو بکسہ واپس کر کے اس کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ یہ نظم ہر لحاظ سے مکمل ہے ایک  
 ادیب و افسر گورنمنٹ ہند کے کانفیڈنشل لفافہ پر متبادلہ خیال کے لئے ایسے بیتیاب تھے کہ شام تک اپنے نہ  
 کرنے کے بجائے دفتر کا وقت ختم ہونے کے آدھ گھنٹہ کے اندر میرے غریب خانہ پر نور محل میں تشریف

. . . . .

. . . . .



اور ساتھ ہی چائے کی فرمائش بھی کر دی۔ میں اس غیر متوقع اور ناخواندہ مہمان کی آمد پر کچھ سٹپٹا سا گیا لیکن اپنی بدحواسی چھپا کر بخندہ پیشانی و احترام ان کا استقبال کیا۔ بس بلا تاخیر نفس معاملہ زیر بحث آگیا۔ میں نے مسٹر نیومن کا خیال معلوم کرنے کے لئے اول انہی سے دریافت کیا کہ موصوف نے کیا رائے قائم کی۔ جواب دیا کہ بس ٹھیک ہے۔ بھوپال میں ماہنامہ نگار کا داخلہ بند کر دیا جائے۔ میں نے داخلہ بند کرنے کی تشریح چاہی تو فرمایا آسان بات ہے گشتی حکم تمام محکмата میں ارسال کر دیا جائے کہ کوئی ملازم نگار کا خریدار نہ بنے۔ میں نے کہا کہ کس قانون کے تحت ایسی پابندی ملازمین پر عائد کی جائیگی۔ ملازمین کی نجی زندگی میں یہ ایسی ہی غیر قانونی مداخلت ہوگی جیسے ملازمین کو حکم دیا جائے کہ صرف فلاں غذا کھانے میں استعمال کرو یا صرف فلاں کپڑا لباس کے لئے مخصوص کرو۔ یہ بھی کہا کہ ضابطہ کا تقاضا یہ ہے کہ اول آپ لائینڈ جسٹس سکریٹریٹ کو متوجہ کریں اور تجویز فرمائیں کہ اس مقصد کے لئے مسودہ قانون مرتب کر کے اسٹیٹ کونسل کی التفاق رائے کے بعد بھوپال لیجسلیٹو اسمبلی کے اجلاس عام سے منظوری حاصل کر کے اس کے تحت قواعد۔ باقی لازماً آرڈیننس کے ذریعہ کسی افسر کو مجاز کریں کہ ناپسندیدہ بیرونی مطبوعات کے داخلہ پر قانون مذکور کے حوالے سے پابندی عائد کرے ورنہ ایسے ہر حکم کو عدالت میں چیلنج کر دیا جائے گا اور آپ کے پاس کوئی قانونی جواز و جواب نہ ہوگا۔ لیکن اس کے علاوہ اس معاملہ کا ایک ادبی اور علمی پہلو بھی ہے جو دلچسپ اور قابل غور ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ سر سید احمد مرحوم سے واقف ہیں؟ فرمایا کہ کون کون سا لکھا آدمی ہے جو سر سید سے واقف نہ ہو۔ میں نے کہا آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ سر سید نے زندگی بھر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کی ہے اور پھر مخلص خدمات انجام دی ہیں لیکن آپ شاید یہ نہ جانتے ہوں گے کہ علماء نے ان کی خدمات کا معاوضہ کفر کے فتوے سے دیا۔ دوسری شخصیت علامہ اقبال کی ہے جو مفکر اعظم اور شاعر ہونے کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں ان کو بھی کفر کے فتوے سے نوازا گیا تھا۔ ان مقدس ہستیوں کی خطا اتنی کتنی کہ انہوں نے نماز کے قائم کردہ اور رواج دادہ اصول سے کہیں کہیں اختلاف کرنے کی جسارت کی تھی۔ یہی قصور نیاز صاحب کا ہے کہ مروجہ ارکان اسلام کو توہمات سے پاک کرنے کی جسارت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا صرف مسلمانوں کا نہیں تمام انسانوں کا خالق اور رب ہے اور قرآن سے ثبوت بھی دیتے ہیں کہ قرآن میں ”سب المسلمین“ نہیں ”سب العالمین“ کہا گیا ہے۔ نیاز صاحب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ تعلیمات اسلامی کا ماحصل یہی ہے کہ تمام انسان روحانی ترقی، تزکیہ نفس اور تکمیل اخلاق کی منازل طے کریں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نگار سے بعض مضامین کے اقتباس بھی مسٹر نیومن کے گوشگزار کئے جو نگار کے صفحات میں جا بجا تانبہ ستاروں کی طرح بکھرے پائے جاتے تھے۔ میری یہ گفتہ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر مسٹر نیومن بغور سنتے رہے اور میں ان کے تاثرات کا مشاہدہ کرتا رہا جو دوران گفتگو میں ان کے چہرہ پر عکس فگن ہو رہے تھے۔ کبھی ان کی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور کبھی حیرت و تعجب کے نقوش ابھرتے رہے اور وہ وقتاً فوقتاً *Noble idea* اور *It is a fact* جیسے ریمارک پاس کرتے رہے۔ اور آخر میں اعتراضات کیا کہ نیاز صاحب کا پیچیدہ مذہبی مسائل کے تجزیہ کرنے اور ان پر تنقید کرنے کا طریقہ واقعی ہمیشہ ہے۔ غالباً ان کے الفاظ جو میرے ذہن میں جم کر رہ گئے تھے یہ ہیں

"Niaz's method of analysing & scrutinising complicated religious matters is indeed unique"

ممكن ہے ان باتوں میں کوئی تغیر و تبدل ہو گیا ہو اور غالباً ایک جملہ اور بھی کہا تھا جواب یاد نہیں آتا۔



# قلق میرٹھی

سید محمد فاروق (شاہپوری)

ایک مقولہ ہے اس میں فلسفیانہ صداقت کا بہت شائبہ موجود ہے کہ "دنیا کے ذی کمال اشخاص کا مشترکہ تئیا یکی دگنما جی کے پردہ پوشیدہ رہتا ہے" اسی کی تائید انگلستان کے حقیقت نگار شاعر گرے نے اپنے مشہور و معروف مرثیہ میں کی ہے۔ یوں بھی جب غائر نظر سے دیکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ان مشاہیر میں سے جو آجکل روشناس عالم ہیں۔ اکثر ایک مدت معینہ تک لاعلمی گنما جی کے قعر ظلمات میں پڑے رہے اور پھر اتفاقیہ ایسے اسباب مہیا ہو گئے کہ دنیا پر ان کے با عظمت کارنامے روشن ہو گئے جن کی سبب وہ لازوال شہرت کے مالک بن گئے ہیں۔ تاریخ اس قسم کے نظائر سے لبریز ہے اور اس کے ثبوت کے لئے کسی خاص منہ دہیل کی حاجت نہیں۔ ہاں اس سے یہ نتیجہ ضرور اخذ ہو سکتا ہے کہ اگر تلاش اور جستجو سے کام لیا جائے تو ابھی اس دنیا میں اور بہت سے خدث ریزے ایسے ملیں گے جن کی جلا اور جن کا فروغ گوزمانے کی دست درازی سے معدوم ضرور ہو رہا ہے۔ لیکن باطناً وہ اپنی دلکشی در عنائی کی بدولت تاج شاہی و کلاہ خسروی کو نوعیت دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے، جنہیں اس کے مختلف مدارج پر کافی عبور حاصل ہے اور جو اس کی شاندار قیام کے نوعیات سے واقفیت رکھتے ہیں یا جن کو اردو شاعری کی تاریخ سے کما حقہ آگاہی ہے وہ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف میں بہت سے ایسے بابرکت نفوس تھے جنہوں نے اس زبان کی خدمت میں اپنی بیش قیمت عمر کا ایک گراںماں حصہ صرف اسے معاصر السنہ کے دوش بدوش لاکھڑا کیا ہے لیکن ہماری غفلت و کھولت نے ان سے روشناس ہونے کا ابھی تک موقع نہیں دیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ بہت سے اساتذہ اردو وجود حقیقت اپنی عظمت و جلال کے لحاظ سے ہر طرح مستحق تعظیم و محض اس وجہ سے قصر گنما جی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہم ان کے کارناموں سے ناواقف محض ہیں اس طبقہ میں جس کو ہمارے ذوق علمی کے فقدان کی جائز شکایت ہو سکتی ہے۔ حضرت قلق کا بھی شمار ہونا چاہئے جن کا نام اور جن کے کارنامے اگرچہ ہمارے علم و دست حلقہ میں قطعی طور پر اجنبی نہیں سمجھے جاسکتے۔ تاہم ان کی نوعیت اور ان کے مفاد سے کم از کم اہل ملک کا بہت بڑا حصہ بخیر حکیم مولا بخش قلق، جن کا نام در حقیقت غلام مولا تھا۔ حکیم مومن خاں دہلوی کے مشاہیر تلامذہ میں سے تھے ان کا وطن تھا لیکن ان کی عمر کا طویل حصہ دہلی میں بسر ہوا۔ دہلی اس وقت باوجودیکہ اس پر خزاں گے جھونکے چلنے شروع ہو گئے تھے۔ علم کے اعتبار سے کلاً و فضلاً کامر جمع بنی ہوئی تھی اور تشنگان فضل و ادب کی نظر دہلی میں اس کی دہی قدر و منزلت تھی جو از منہ سالانہ عروج اسلام کے پہلو پہ پہلو نیشاپور بغداد کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ قلق نے حیات مستعار کی بارہ منزلیں بمشکل طے کی ہوں دہلی کے آب و دانہ کی کشش سے مجبور ہو کر انھیں اپنے وطن مالوت کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس سفر سے غرض محض اکتساب علم تھی



اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی لکھنے پڑھنے کی ضرورت کس قدر محسوس کی جاتی تھی اور حصول کمال کے لئے کیا کچھ صعوبتیں خاطر خوشی برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ میرٹھ سے دہلی دور نہیں لیکن قلق سے قطع نظر اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہو گا کہ شائقین علم دفن دور دور سے یہاں صرف اس لئے آتے تھے کہ کمال فضل کے اُن ذخائر سمندر در سے اپنی تشنگی بجھائیں جن کو سرزمین دہلی کے سیراب کرنے کی خدمت قدرت کی جانب سے سپرد ہوئی تھی غرض قلق نے دہلی میں رہ کر اپنی مراد پائی اور اس وقت کے رواج کے مطابق کوئی خامی ان کی تعلیم میں باقی نہیں رہی۔ خوش قسمتی سے انھیں استاد ایسے کامل الفن ملے جو اپنے وقت کے مشاہیر تھے۔ فارسی کی تحصیل انھوں نے مولانا امام بخش صہبائی ایسے جید فاضل سے کی۔ عربی اور دیگر علوم و فنون۔ از قسم منطق و فلسفہ، صرف دکنو کے لئے ملا انتظام علی مرحوم سہارنپوری کے سامنے زانو تہ کیا جنکی بے دریغ قابلیت و وسعت معلومات کے فسانے آج تک زبان زد ہیں۔ طب کو دہلی کے مشہور و معروف حکیم غلام نقشبند خاں مرحوم و معذور سے سبقاً سبقاً حاصل کیا۔ حکیم صاحب مرحوم اس وقت کے نامور اطباء میں تھے جن کی حذاقت کا شہرہ دہلی سے باہر بھی بہت دور دور تھا۔ بہر حال انھیں کاملوں کا فیض تھا کہ قلق بالآخر علمی حیثیت سے خود کامل بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بہت جلد تھے اور ان کی طبیعت قدرتی طور پر نہایت رسا واقع ہوئی تھی۔ درس فارسی میں صہبائی کے فرزند گرامی قدر مولوی عبد الکریم تھے بھی ان کے شریک تھے۔ جو اپنی ذہانت و طباعی کے لحاظ سے الولد سترلابیہ کے پورے پورے مصداق تھے۔ لیکن قلق اپنے عام ہم جماعتوں سے فوقیت رکھتے تھے گویا آجکل کی اصطلاح کے بموجب وہ اپنے کلاس کے مانیٹر تھے اور یقیناً یہ امتیاز ان کی جودت اور تیزی کی کافی دلیل ہے۔

دہلی اس عہد میں شاعری کے اعتبار سے اپنے جو بن پر تھی۔ ذوق و غالب و مومن نے اپنی کلفشانیوں سے اسے شک و گلاز بہنا رکھا تھا۔ خود بادشاہ عالی جاہ شاعر و سخن کے دلدادہ و قدردان ہونے کے ماسوا ذاتی طور پر عملاً اس سے چسپی لیتے تھے ان کا یہ ذوق و شوق عوام کے لئے کچھ کم باعث تشویق نہ تھا۔ چنانچہ اس عہد کی مجالس سخن کی پرکیف روئیدادیں یقینی و پرورد شاعری کی تاریخ کا ایک روشن باب سمجھی جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ تحریص و تشویق کے یہ تمام اسباب جمع ہونے کے علاوہ قلق کو قدرت کی طرف سے جذبہ شاعری و دیعت کیا گیا تھا اور اس حالت میں ناممکن تھا کہ اس سے کام نہ لیا جاتا۔ انھوں نے ہم آہنگی کے اس راستے پر قدم رکھا اور کچھ ایسی استقامت سے رکھا کہ شروع سے آخر تک کہیں ڈگمگائے نہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ قلق اپنے استادوں کی طرف سے نہایت خوش نصیب تھے۔ شاعری میں بھی انھیں مومن ایسا نامور استاد کمال سخنور ہاتھ آگیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ ان کی طبیعت فطری طور پر اس رنگ میں رنگی گئی تھی۔ جس کی گھلکاریاں کلام مومن کی باب دزینت کو آج تک قائم رکھے ہوئے ہیں اور شاید یہی سبب ہو کہ انھوں نے بجائے ذوق و غالب کے مومن کو شاہراہ غمخواری میں اپنا ہادی درہبر بنایا۔ مومن کو بھی ہونہار شاگرد میں کچھ ایسی بات نظر آئی کہ انھوں نے اس کی تربیت و اصلاح میں غیر معمولی درجہ سے کام لیا۔ مومن کا قاعدہ یہ تھا کہ باعتبار نوعیت اذکار اپنے تلامذہ کے دو حصے کر رکھے تھے۔ ایک عام اور دوسرا خاص، مطلب یہ تھا کہ جو طباع اور ذہین شاگرد ہوتے ان کے کلام کو غائر نظر سے دیکھتے اور انھیں ان نکات شعری سے آگاہ کرتے انھیں تعلیم کی صلاحیت عام دماغوں میں نہیں ہوتی۔ قلق کو بھی اسی طبقہ خواص میں جگہ دی گئی تھی۔ چنانچہ استاد کی غیر معمولی توجہ نتیجہ یہ ہو کہ تھوڑے عرصہ میں شاگرد کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اور اس کی شہرت ایک خوشگو شاعر کی حیثیت سے تمام شہر میں پھیل گئی۔ قیاس کہتا ہے کہ مولانا حالی اس زمانے میں دہلی میں موجود تھے۔ اس لحاظ سے آپ کے مندرجہ ذیل الفاظ گویا چشم دید شہادت



کا درجہ رکھتے ہیں جو آپ قلق کے بارے میں فرماتے ہیں۔

”ہر جاکہ بزمِ مشاعرہ انعقاد می یافت با استادان دیگر ہم طرح شدہ داد غزلسرائی میدانند و حاضرین را تعجب بر تعجب و حیرت بالا نے خیرت می افزودند۔“

یہ مشاعرے دہلی کے دور آخر کی ایک یادگاری چیز تھے۔ افسوس ہے کہ ان کی مفصل کیفیت آج مفقود ہے۔ درنہ ہر اعتبار سے ان کے تذکرے مستقل دلچسپی کا سامان پیدا کرتے۔ ان مجلسوں میں دہلی و بیرونجات کے ذہنی شہرت آساتذہ شہرت ہوتے تھے۔ ان ناموروں کے سامنے رنگ جمانا ہر ایک کا کام نہیں تھا اور یہ امر قلق کی کلاہ امتیاز کے لئے ایک زرین طریقہ کار انھوں نے ایسے مجموعوں میں اپنا نام اس خوبی سے اچھالا۔

دہلی کی آب و ہوا قلق کو ایسی راس آئی کہ وطن سے آکر واپس جانے کا نام نہ لیا۔ لیکن فتنہ غدر کے نمودار ہونے پر وہ زندگی ایسی پر آشوب ہو گئی تھی کہ مجبوراً معاودت وطن کا قصد کرنا پڑا۔ ادب اب جب میرٹھ آئے تو ایسے جے کہ پھر کہیں بکا نہ کیا۔ قیام میرٹھ کا یہ زمانہ معمولی مشاغل روزمرہ کے نذر ہوا۔ کچھ عرصہ تک بعض مدارس میں مدرس فارسی کی خدمات انجام اور مطب بھی ہمیشہ جاری رکھا۔ غرض کہ فکر معیشت سے جو کچھ فرصت نصیب ہوتی اس کا ایک حصہ خلق اللہ کی خدمت لئے وقف تھا۔ ذاتی اوصاف کے اعتبار سے وہ نہایت قناعت پسند غیور اور مستغنی واقع ہوئے تھے ماس لئے یہ کہنا واقعہ ہو گا کہ طبابت کا پیشہ مالی قابضہ کے لئے اختیار کر رکھا تھا وہ حقیقی شاعر تھے اور ایک سچے شاعر کی شناخت یہی دنیاوی جاہ و عیش پسندی کے سامان سے اس کا دل بے علاقہ رہے۔

اس کا انتقال ۱۲۹۶ ہجری میں ہوا۔ اولاد حقیقی کے متعلق کچھ تحقیق نہیں ہو سکی لیکن ان کا کلیات جو تقریباً تمام اصناف پر حاوی ہے۔ اولاد معنوی کی حیثیت سے ان کا نام روز اب تک قائم اور زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس کلیات کی انھوں نے اپنے حین حیات کر لی تھی۔ لیکن اشاعت کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ سفر آخرت اختیار کیا اور بھائی کو وصیت اسے چھو کر ان کی عمر بھر کی کمائی کو ٹھکانے لگا دیں۔ چنانچہ ان کے موجودہ و متداول دیوان کی اشاعت ان کے بھائی کی مرہون کی مرہون ہے۔ اس کا ایک نسخہ ایک کرم فرما کی عنایت سے بغرض مطالعہ حال ہی میں دستیاب ہوا ہے اور اس دیکھنے کے بعد قلق کی شاعری کے متعلق جو خیالات دل و دماغ میں پیدا ہوئے انھیں مختصر قلم بند کرتا ہوں۔ اگرچہ اسباب نظر ڈلے بغیر نتیجہ پر پہنچ جانا کسی حالت میں دل پسند نہیں کہا جاسکتا نہ اصولاً جائز ہو سکتا ہے تاہم آغاز تبصرہ میں میں بیان کہہ سکتا ہوں کہ قلق کی شاعری کا درجہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور وہ بہر صورت آساتذہ اردو کے صفِ پیشین میں جگہ پا مستحق ہیں۔ ان کا مذاق نہایت شستہ اور ان کے جذبات غایت درجہ پاکیزہ ہیں۔ ان کے تخیل کی بلند پروازی، ان کے خیال کی وسعت اور ان کی حسیات کی بلند پایگی نے ان کے کلام کی منزلت کو کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ طرز بیان کی سلاست مضامین کی متانت و سنجیدگی، زبان کے محاسن کے ساتھ سونے میں سہاگے کا کام دیتی ہے۔ مولانا شبلی جن کی ناگہانی دنیا نے اسلامی دنیا کو ایک فلسفی مورخ کی پر مفاد ذات سے حال میں خالی کر دیا ہے۔ موازنہ انیس و دسیر کی تہذیب فرماتے ہیں:

”شاعری کے دو جز ہیں، مادہ و صورت۔ یعنی کیا کہنا چاہئے اور کیونکر کہنا چاہئے۔ انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے جوش و مسرت، عشق و محبت اور درد و فخر و غم، حیرت و استعجاب، طیش و غضب وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کو جذبات سے



تعبیر کرتے ہیں۔ ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی ہیولے ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے، یہ شاعری کا دوسرا جزو یعنی اس کی صورت ہے اور انھیں دونوں جزوں کے مجموعہ کا نام شاعری ہے۔

کلام قلق کے مطالعہ کے بعد انصافاً کہنا پڑتا ہے کہ اس میں شاعری کے دونوں جزو جنھیں فی الحقیقت اجزائے لایتجزائے مانا جاتا ہے، یعنی ہیولے و صورت، اپنی اصلی اور حقیقی شان میں جلوہ گر ہیں۔ قلق کا ایک ایک شعر اس بات کا کفیل ہے کہ ان کے بات صادقہ میں تصنع کا نام نہیں اور پھر ان جذبات کو انھوں نے جس انداز سے منظوم کیا ہے۔ اس کو پڑھ اور سن کر کوئی شخص متاثر ہوئے رہ نہیں سکتا۔ یہ اشعار نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

جس روز حزن عشق ہم آہنگ صورتھا  
اے مشت خاک تجھ کو تامل ضرور تھا  
اک حرف شوق لاکھ زبانوں پہ جا پڑا  
ور د ملک محتاجو، وہی شورِ طیور تھا  
بے اعتباریوں نے مری تجھ کو کھو دیا  
ہے مجھ میں جو نہاں وہی تیرا ظہور تھا

کیا نکلتا ہے طریقہ دیکھئے تغزیر کا  
بازوئے قاتل پہ صدمہ ہے مری تقصیر کا  
اشک، مژگاں سے ٹپکتے ہی زمین پر پارتھا  
دل میں شاید گھل گیا پیکاں تھا اے تیر کا

خوشی میں بھی نوا سنج فغاں ہوں  
زمین و آسماں کا راز داں ہوں  
میں اپنی بے نشانی کا نشان ہوں  
ہجوم ماتم غم سر رواں ہوں  
نہیں کچھ کام بخت و آسماں سے  
میں ناکامی میں اپنے کامراں ہوں

طرز رنگ یہ جامہ سے باہر نقاب میں  
رسوائیاں حجاب طلب ہیں حجاب میں  
ہے زلزلے میں گاہ، گہے اضطراب میں  
اُس کی بلار ہے دل، خانہ خراب میں

نقش بر آب نام ہے، سیل فنا مقام  
اس خانماں خراب کا کیا نام کیا مقام  
ضرور تھا، طیور تھا، یہ غزل سر دیوان ہے۔ اس میں ایک حد تک تصوف و معرفت کی چاشنی موجود ہے۔ اس رنگ میں اشعار بھی قابل دید ہیں۔ کس جوش بے خودی میں کہتے ہیں۔

نہ ہو آرزو کچھ یہی آرزو ہے  
نقط میں ہی میں ہوں، تو پھر تو ہی تو ہے  
نہ یہ ہے نہ وہ ہے نہ میں ہوں نہ تو ہے  
ہزاروں تصور اور اک آرزو ہے  
نہ امید جھوٹی نہ کچھ یا بس سچی  
نہیں جو کہیں بھی وہی چار سو ہے  
کے ڈھونڈتی ہیں یہی ڈھونڈتی ہیں  
یہی جستجو ہے اگر جستجو ہے



ان اشعار کے تمام مضامین نہ صرف باعتبار جذبات کے قابل قدر ہیں بلکہ درد و تاثیر کے علاوہ ان میں وہ کیفیات پوشیدہ ہیں جن کو صرف وجدان سلیم کما حقہ محسوس کر سکتا ہے۔ بلاشبہ قلق کے کلام کی ایک معمولی خصوصیت تاثیر بیان و سنوڑ و گہرائی ہے جس کا قلب صافی پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ خواہ مضامین کسی نوع کے ہوں لیکن تاثیر درد سے نہیں چنانچہ یہ اشعار دیکھئے۔

حذر اک دم خیال مدعی سے ہو نہیں سکتا  
یہ کہنا ہے تو کیا کہنا کہ کہتے کہتے رک جانا  
نہ مجھ کو دوش پر تا گورے جائے نہ موت آئے

تمہیں الزام کیا دوں جب مجھی سے ہو نہیں سکتا  
بیان حسرت دل بھی تو جی سے ہو نہیں سکتا  
یہ کس کام آئے گی کچھ بیکیسی سے ہو نہیں سکتا۔

اس میں جو سوز پوشیدہ ہے اس کا اندازہ اہل دل خوب کر سکتے ہیں۔  
تجھ کو ارمان خرابی ہے جو لے دہلی اور  
لفظ دہلی نے معنی میں جو سوز و گداز پیدا کر دیا ہے وہ کسی اور طریقہ سے غیر ممکن تھا۔ ان شعروں میں حسرت و سوز کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

کیا آرزو نکالیں جی سے نہیں نکلتے  
بیمٹھوں تو دعا منزل بھول تو درد رہبر  
باقی سوا تمہارے اب دل میں کیا رہا ہے  
سر پر اٹھانے والا اک آبلہ رہا ہے

داغ منزل اور درد رہبر کی یہ ترکیبیں وہ ہیں جو خاندان مومن مغفور سے مختص سمجھی جاتی ہیں ان کی چند دلفریب نظیریں ذیل اشعار میں ملیں گی۔

اے عطف چارہ فرما تدبیر اسکی کیا ہو  
سخت دشوار ہے آسان کا آسان ہونا  
حادثہ زرا میں محبت کی نگاہیں کیا کچھ  
کی ہے آخر کو ناشتہ شکنی  
فلک کو عشوہ ترا سخت تنگ رکھتا ہے  
وہ نگہ خوش خواب بد مستی دروغ  
سہل ہے انجام تشویش محال

جو ہے علاج دل کا آزار ہے وہ جاں کا  
خون فرصت ہے یہاں سر بگریباں ہونا  
راہ ہم دیکھتے تھے تیری کہ محشر آیا  
داغ پر داغ ہم تو کھٹا بیٹھے  
کنارہ ستم نامتہام لیتا ہے  
وہ مژہ مصروف بیکاری غلط  
میری دشواری کی دشواری غلط

مندرجہ بالا اشعار سے ناظرین کرام نے اندازہ کیا ہو گا کہ تخیل و مذاق کے اعتبار سے کلام قلق میں کلام مومن کا پورا ہر تو موجود ہے، بلکہ بسا اوقات شاگرد کی دقت پسندی نے ایسی پختگی دکھائی ہے کہ دونوں میں کوئی ماہ الاستیا از ستم نظر نہیں آتا ایک جگہ کہتے ہیں۔

جو ہر آسمان سے کیا نہ ہوا  
سعی جاں لایق دوش نہ ہوئی

دو خور عرض مدعا نہ ہوا  
درد دل قابل دوا نہ ہوا



حیف دست دعا و دامن ناز خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا

اہل قبلہ کو ہے تلاش امام

مے قلق تو ہی پارسا نہ ہوا

ان شعروں میں حضرت غالب کی مخصوص روش کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ جس نے مضامین کی شگفتگی و دلکشی میں کچھ اور مادہ کر دیا ہے۔ اسی قسم کے چند شعریہ بھی ہیں۔

گرمی کو شش جفا کب تک دعوئے شہرت و فاکب تک

اے دل زہر خور یا کب تک نامرادانہ مدعا کب تک

قدرت صبر عاقبت کتنی جرأت طاقت آزما کب تک

کیجئے اب مری نباہ کی فکر یار صبر گرینہ پاکب تک

مندرجہ ذیل اشعار ایک مختصر غزل کے ہیں لیکن ان کی برجستگی و لطافت معنوی غیر محدود ہے۔

دل بڑی چیز ہے تو ہم بھی دے بیٹھے ہیں کون بیتاب پھر دم کو لئے بیٹھے ہیں

چاک دل، ٹکڑے جگر، جس پہی سوطر کی چھڑ تو سمجھتا ہے کہ ہم منہ کو سے بیٹھے ہیں

ادب د عطف تو دیکھو کہ جکے جاتے ہیں کیا مسلمان ہیں مسجد میں بیٹھے ہیں

پوچھ مت حسرت ہجرال کو کہ ہر شب گویا تجھ کو آغوش میں ہم اپنے بیٹھے ہیں

عادت نالہ د فریاد کو کیا پوچھتے ہو چرخ کی جان کو ہم صبر کئے بیٹھے ہیں

مطلع کن قدرت نثار ہے

کن نگاہوں سے دل مستانہ ہم پیمانہ کھا رنگ جستہ لبہں خاک در میخانہ کھا

اسی غزل کے یہ دو تین شعر قابل توصیف ہیں۔ دوسرا شعر کتنا حسرت تاک ہے ارباب ذوق سلیم خود انصاف فرمائیں۔

ذکر تیرا سن کے ناصح سے اسی کے سر ہوا تیرا دیوانہ مگر مطلب ہی کا دیوانہ کھا

اشک کے گرتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا کون سی حسرت کا یارب یہ چراغ خانہ کھا

شمع جلنے پر مری انگشت حیرت بن گئی اور غبار گرم کھل دیدہ پر دانہ کھا

آخری شعر نازک خیالی اور معنی آفرینی کی ایک حیرت انگیز مثال ہے اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ قلق میں نغز گوئی کے

ساتھ جدت پسندی کا کافی مادہ و دیعت کیا گیا تھا چنانچہ اکثر مضامین اس قدر عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی بالکل نئے

معلوم ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ان کے تخیلات کی بوقلمونی کا قایل ہونا پڑتا ہے۔ محبت کی یہ تعریف کس قدر صحیح طور پر کی گئی ہے۔

محبت وہ ہے جس میں کچھ کسی سے نہیں سکتا جو ہو سکتا ہے وہ بھی آدمی سے ہو نہیں سکتا

فارس کا ایک شہور شعر اسی سے ملتا جلتا ہے۔

عاشقی چیت بگو بندہ جاناں بودن دل بدست دگران دادن دحیراں بودن

لیکن منصفی شرط ہے، قلق کے بیان میں جو لطافت و نزاکت ہے۔ وہ فارسی شعر میں نہیں ہے۔ ایک دوسری جگہ خلد کی

ہانی کا ثبوت اس طرح دیتے ہیں۔



بہر آبادی ہے ہم خانہ خرابوں کی طلب کوئی گھر خلد کے مانند نہ دیراں ہوگا

عشق کی پیدائش کی تاریخ مختصر لیکن پر معنی الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے

کون جانے کھنسا اس کا نام و نمود میری بربادی سے بنا ہے عشق

قانون محبت نے "شرکت" کو منزله "شرک" قرار دیا ہے۔ اس خیال کو مختلف شعرا نے مختلف طریق سے بانڈھا

چنانچہ داغ مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

اسی انداز کا ایک شعر قلق کلے کہتے ہیں

محبت میں کہاں شرکت گوارا اٹھائے نالہ کیوں تہمت اثر کی

مندرجہ ذیل شعر میں جو کیفیت دکھائی گئی ہے اس کے صداقت آمیز اثر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ دیکھئے گوچند الف

میں مطلب بیان کر دیا گیا ہے لیکن اس پر جس قدر غور کیا جائے۔ اسی قدر معانی میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ

کہ اس قسم کا ایک شعر بھی حاصل کر لیا جاسکتا ہے

گردش چشم سے ساقی کی پھر اے خانہ مے گری جام میں اور گرتے ہی چکر آیا

اسی نوعیت کے یہ دو شعر ہیں جن کی خوبی توصیف سے مستغنی ہے۔ فرماتے ہیں

لحاظ رند کو وہ غلط تو سمجھ دے میں دیکھ خصوص جب کف ساقی سے جام لیتا

ہر طرح جب اپنی مشکل کو نہ آساں دیکھنا موڑ کر گردن تری جانب ہر آساں دیکھنا

ان دونوں شعروں میں ہر ایک سین بجائے خود مکمل ہے۔ اشعار نہیں ہیں بلکہ دو جدا گانہ حالتوں کو الفاظ کا جامع پہن

سامنے لا کر کیا ہے۔ ان کی بلاغت معنوی پر غور کیجئے تو بے ساختہ احسنت و مرجبا کہنے کو جی چاہتا ہے۔ شاعر نے کیفیات

اظہار کے لئے کسی تفصیل و تصریح کی ضرورت نہیں رکھی۔ بلکہ اشارۃً مختصر لفظوں میں حالت بیان کر دی ہے پڑھنے

بقدر ظرف اس کے لطائف باطنی کو وسعت دے سکتا ہے۔

کہیں کہیں محض تراکیب و بندش سے اور کسی کسی جگہ ایک آدھ لفظ کی موزونیت سے سارے شعر میں جان ڈال دیا

ہے۔ مثلاً یہ اشعار

اک آسماں کو پھونکا اک آسماں بنایا

یاں آشیاں بنایا وں آشیاں بنایا

زیر زمین چھپ کر بالائے بام نکلا

داغ اٹھ کر آبلہ بیٹھے

آج وہ تیرے در پہ آ بیٹھے

آشنا ہیں جدا جدا بیٹھے

دیکھو ستم ظریفی دو دہل و جگر کی

فضل بہار اپنی گزری ہے یونہی ساری

کیا در پے مکین ہے بہر نظر خورشید

بے تکلف مقام الفت ہے

کل جو تاج و چشم کر چھوڑا اٹھے

انجمن ہے تری طلسم رشک



ان سطور کے دیکھنے کے بعد اہل نظر رائے قائم کر سکتے ہیں کہ تعلق کا معیار شاعری بہت بلند ہے، ان کا معشوق بازاری ہیں اور اسی سبب ان کے کلام میں سوقیانہ مضامین اور بازاری رمز اور کنائے کلتیہ ناپید ہیں۔ شاذ و نادر ان کے یہاں بھی شوخ بانی کے نمونے مل سکتے ہیں مثلاً :-

اپنا گھر چھوڑ کے وہ غیر کے گھر رہنے لگے      ہائے کیا شرم چڑھی ہے اکھیں رسوا ہو کر

غیروں کو ہونٹ چاٹتے ہم دیکھتے کبھی      ہوتا مرزا جو تیرے دہن کے لعاب میں

ایک ہم ہیں کہ ترے نام کا لینا آفت      ایک وہ ہیں کہ تجھے گھر میں بٹھا رکھتے ہیں

اغیار بواہوس کا ہجوم اور تم خموش      بے شرمیوں کی فکر میں ہے آپ کا لحاظ

اول تو ان کا انداز بیان چنداں قابل اعتراض نہیں۔ دوم یہ کہ ان کا اصلی رنگ نہیں اور اس لئے اس قماش کے گئے چنے شعرا نادر کا معدوم کے تحت میں آنے کی وجہ سے کسی خاص وقعت کے قابل نہیں ان کی طبیعت کے فطرتی جوہر دیکھنا چاہو ان اشعار کو پڑھو اور اندازہ کرو کہ ان میں سے ہر ایک محاسن شعری کا دلپذیر مجموعہ ہے جس سے ذی قدر مصنف کی عظمت کمال بین ثبوت بھی ملتا ہے :-

در پوشیدہ کسی ڈھب سے نہ پہاں ہوگا      تجھ پہ مرنا مرے جینے سے نمایاں ہوگا  
بعد مردن بھی یہ کمبخت دبائیں گے مجھے      اہل درماں کا قضا سے بھی نہ درماں ہوگا  
ہے ہی سوز تو کیا غم ہے سیہ روزی کا      رنگ بر حسبہ مرا سرد چراغاں ہوگا

وہ بعد قتل سوگ میں کفا شادیاں نہ تھا      افسوس ہے مجھے بھی کہ میں سخت جاں نہ تھا  
تھا اپنا ہی خیال غلط مدعی نہ تھے      تھا اپنا ہی فساد نظر آسماں نہ تھا  
تا داستان وصل تو غم خوار تھے حریف      جب درد دل کہا تو کوئی درمیاں نہ تھا

غیر نے پہلی ہی شب پر وہ اٹھا رکھا ہے      تم نے کیوں رخ سے نقاب شکن آرا لٹا  
بیکیسی سے ہیں ماتم کا - ہے اپنے ماتم      دل کچھ اس طرح بھرا یا کہ کلیجہ آ لٹا  
اپنے ہی تیر کے ہم آپ - نشانہ بھرے      منھ کے بل نالہ دل زور میں آیا لٹا

کیا آشیاں بتائیں کہاں تھا کہاں نہ تھا      تھا جلوہ گر فریب نظر گلستاں نہ تھا  
ممکن کہ کوئی اس کی طرف دیکھ بھی سکے      اس پر بھی اعتماد ہمارا وہاں نہ تھا



دی جاں پیام وصل میں اور کس خوشی کے ساتھ یہ محسوس دیکھتے کہ زیاں بھی زیاں نہ کھتا

قون افلاطون غلط بالصدق اگر ہوتا علاج  
کچھ تو مایوسی کو بھی بہانہ مہلت چاہئے  
رنجش بیجا کا ہوتا شکوہ برحبا علاج  
گو کہ رنج افزا ہے پر محب کو پسند آیا علاج

بلکہ خون تمنا کا ہے بر میں دل نہیں  
آسمان مصروف سماں وصال غیر ہے  
داغ اشک گرم کلے مردان میں تل نہیں  
سر بہ جیب غور ہے کچھ نیند میں غافل نہیں  
ہر جگہ کبہ ہے لیکن سجدہ کی مہلت کہاں  
خاک ہم سے آسمان سو سو طرح چھوٹے کا  
ہر قدم منزل ہے لیکن فرصت منزل نہیں  
اسے ہجوم آرزو تو خاک میں بھی مل نہیں

جگر کے زخم کو اور چارہ گر کو دیکھتے ہیں  
چراغ دور سے خورشید کو دکھاتے ہیں  
جود دیکھتے ہیں ہم ان کے جگر کو دیکھتے ہیں  
ہم اپنی شب کا تماشا سحر کو دیکھتے ہیں  
یہ کون ہیں جو مری چشم ترکو دیکھتے ہیں  
ہم ان کو اور وہ ہماری نظر کو دیکھتے ہیں

شوخی کے لاکھ شیوے ہیں پر یہ اول ہے کیا  
جس میں کہ تو ہی تو ہو دہی آرزو نہ ہو

ہاں ہمہ نشینی کا مجھے دھیان ہے اسکی  
آب آب ہو پیکر اُسے جتنا کہ تنگ ظرف  
پر دہ ہے مرا شوق تماشا مرے آگے  
ہے غرق عرق اتنی ہی صہبہ مرے آگے  
خورشید لب بام گر اٹھا مرے آگے  
محشر مرے پیچھے ہے وہ فتنہ مرے آگے

جس جگہ لے کے چشم تر بیٹھے  
کچھ تماشا ہے کھیل ہے کیا ہے  
اٹھتے ہی اٹھتے گھر کے گھر بیٹھے  
اک زمانے کو قتل کر بیٹھے  
ہم تو مرنے سے پہلے مر بیٹھے  
کیسے مہنتے ہیں نوحہ گر بیٹھے

غزلیات کے علاوہ رباعیات، قطعات، قصائد، ترجیع و ترکیب بند، واسوخت، مرثیے، تازیانی، اور منظوم خطوط بھی ہیں، جو حضرت  
قلق کی استاد کی ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے لئے ایک جداگانہ مضمون کی ضرورت ہے۔  
خون تمنا کا بید اور اشک گرم کا داغ دونوں عجیب و نادر تشبیہات ہیں جن کی لطافت و بیان سلیمیت پر شیدہ نہیں۔



# ہندوستان کی کرنسی اور عہد مغلیہ کے سکے

یافتہ چھوٹی

وادی سندھ کی قدیم تہذیب یا عہد رگ وید میں کسی سکے کا رائج ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس وقت دین کا دستور کیا تھا؟ آباوہ صرف باہمی تبادلہ اشیاء پر منحصر تھا یا اس کے لئے کوئی اور طریقہ رائج تھا۔

ترمیج سکے کے نشانات سب سے پہلے ہم کو آخری ویدی زمانہ میں ملتے ہیں۔ جبکہ چندرگپت موریہ کے عہد حکومت میں رتی کے وزن کی بنیاد پر کاررواج شروع ہوا (۳۰۰ ق۔م) اس وقت رتی کا وزن موجودہ اوزان کے لحاظ سے ۸۳ گرین تھا۔

شمالی ہند میں بھی عہد اسوکا سے قبل (۲۷۲ ق۔م) سکے رائج ہو چکے تھے جن میں خاص خاص یہ تھے:-

(۱) پن یا کارشاپن تانبہ کا سکے ۸۰ رتی کا۔

(۲) تنکے (نقرئی سکے) آٹھ رتی یا چار پن کے برابر۔

(۳) کارشاپن - دھرن - پڑانے - درام (نقرئی سکے) ۳۲ رتی کا

(۴) دینار (طلائی سکے) ۳۲ رتی کا، سوورن یا کارشاپن (طلائی سکے) ۸۰ رتی کا - نیشک (طلائی سکے)

۳۲۰ رتی کا۔

گوڑیاں بھی سکے کا کام دیتی تھیں اور ایک پن ۸۰ کوڑیوں کا ہوتا تھا، دکن کی حکومتوں میں دینار کے مختلف نام تھے:-

پن، ہنو، وراہ یا بھاگوت جس کو پرتنگالیوں نے پگوڈا کر لیا۔ نصف پگوڈا کا سکے۔ کا شو کہلایا جس سے انگریزی ان کا لفظ cash ماخوذ ہے۔ ایک طلائی سکے کا نام پنم بھی تھا جس کی قیمت پگوڈا کے دسویں حصہ کے برابر تھی۔

تیرھویں چودھویں صدی عیسوی میں شاہانِ دہلی نے بھی دینار۔ پگوڈا اور تنکے کے نام سے سکے مسکوک کرائے۔ شیرشاہ نے ۱۵۲۲ء ایک نقرئی سکے روپیہ کے نام سے بھی مسکوک کرایا (روپا چاندی کو کہتے ہیں) جو مسلم دہرطانوی عہد حکومت میں بھی رائج رہا اور اب تک کاچلن باقی ہے۔ گوہس کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

شاہ رخ میرزا پسر امیر تیمور، فرہاروند نے ہرات کا نقرئی سکے ایک مثقال وزن کا شاہ رخ کہلاتا تھا۔ جب بابر نے دہلی فتح کیا تو اس نے کابل کے ہر شخص کو ایک ایک شاہ رخ تقسیم کیا۔ بابر ۱۵۲۵ء میں مرگیا اور ہمایوں جانشین ہوا۔

۱۵۵۵ء میں شیرشاہ نے ہمایوں کو شکست دی اور فرہاروندائے ہند ہو گیا۔ حسب بیان ابوالفضل سب سے پہلے روپیہ اسی کے زمانہ میں مسکوک ہوا۔ ہندی میں چاندی کو کہتے ہیں اور یہ سکے بھی چاندی کا تھا۔ ۱۵۵۵ء میں شیرشاہ مرگیا، اس کے جانشین ہمایوں تھے اس لئے ہمایوں ان کے لڑ بھڑ کر ہمایوں کو شکست دے کر پھر دہلی پر قابض ہو گیا۔ جب اس کی وفات پر اس کا بیٹا اکبر تخت نشین ہوا (۱۵۵۵ء) تو ایک تودہ وزن کی مسکوک ہوئی جس کے ایک رخ پر خلفائے راشدین کے نام منقوش تھے اور آیت "اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب" دوسری طرف



”اکبر السلطان الاعظم الخاقان المعظم خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ“۔ کچھ زمانہ بعد ملا احمد علی نے ایک نیا طلائی سکہ ”شہنشاہی“ کے نام سے تیار کیا اور فیضی کی یہ رباعی کبذہ کی۔

خورشید کہ ہفت بھراز و گوہریافت سنگ سپہراز پر تو او جوہریافت  
کاں از نظر تربیت او زریافت و اں ز شرف از سکہ شاہ اکبر یافت  
عہد اکبر میں ایک اور سکہ روہاسن کے نام سے مسکوک ہوا اور یہ رباعی اس پر منقوش کی گئی :-  
ایں نقد رواں گنج شاہنشاہی یا کوکب اقبال کند ہمراہی  
خورشید پرورش از اں رو کہ بدہر یا بد شرف از سکہ اکبر شاہی  
ایک سکہ اور رائج ہوا جس پر یہ رباعی کندہ تھی :-

ایں سکہ کہ دست بخت راز لور باد پیرایہ سپہ و ہفت اختر باد  
ز برین نقد ست کار از و چون زرباد دروہر رواں سکہ شاہ اکبر باد

اکبر نے ۱۵۵۶ء میں وفات پائی اور جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس وقت خزانہ ہونا چاندی اور جواہرات سے مالا مال تھا خانی خان کہے کہ اس وقت دس کروڑ روپیہ کی اشرفیاں (گیارہ ماشی، تیرہ ماشی، چودہ ماشی) اور بڑی اشرفیاں سو سو، پان پان سو تو لوں کی علاوہ ۲،۲ من سونا، ۳ من چاندی اور ایک من جواہر خزانہ میں موجود تھے۔ حسب روایت خانی خان :-

جہانگیر نے حکم دیا کہ ۔ طلائی سکہ کے ایک طرف اس کی تقری شبیہ منقوش کی جائے اور دوسری طرف شیر کی۔ یہ اشرفی امراء کو دی تاکہ وہ اپنے دستار یا سینہ پر آویزاں کریں۔ اس پر یہ شعر منقوش تھا :-

قضا بر سکہ زر کرد تصویر شبیہ حضرت شاہ جہانگیر  
جو سکہ دار الضرب آگرہ میں مسکوک ہوا اس پر یہ شعر منقوش تھا :-  
حروف جہانگیر و املا کبر ز روز ازل درابد شد برابر  
تذکر جہانگیری میں ذیل کے طلائی سکوں کا ذکر کیا گیا ہے :-

نور شاہی (۱۰۰ تولہ)۔ نور سلطانی (۵۰ تولہ)۔ نور عدالت (۲۰ تولہ)۔ نور کرم (۱۰ تولہ)۔ نور جانی (۵ تولہ)  
نورانی (۱ تولہ)۔ رواجی (۳ ماشہ)

ایک طرف کلمہ طیبہ درج تھا اور دوسری طرف یہ شعر :-

بخط نور بر زر کلک تقدیر رقم زرد شاہ نور الدین جہانگیر

جب ۱۵۵۷ء میں جہانگیر ماندو سے لوٹ کر کھمبایت پہنچا تو صوبہ دار گجرات نے اس کی یاد میں ایک نیا سکہ مسکوک کرایا۔  
پر یہ شعر درج تھا :-

یہ زرایں سکہ زرد شاہ جہانگیر ظفر پر تو پس از فتح دکن آمد چو از گجرات در ماندو

کتاب مختصر سیر گلستان ہند میں عہد جہانگیر کے ایک اور سکہ کا ذکر پایا جاتا ہے جس پر یہ شعر منقوش تھا :-

سکہ زرد در شہر برہانپور شاہ دیں پناہ شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

آخر عہد حکومت میں نور جہاں کا نام بھی اس طرح منقوش ہونے لگا :-



ز حکم شاہ جہانگیر یافت صدر یور

بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

جہانگیر کے بعد شاہ جہاں نے نور جہاں کے نام کے تمام سکے منسوخ کر کے خزانہ شاہی میں داخل کرادیے اور پھر انہیں گلا کر سرے نئے سکے مسکوک کرائے۔

اس کے بعد سکوں پر جو اشعار منقوش تھے ان کی تفصیل یہ ہے :-

|                                 |                                   |                          |
|---------------------------------|-----------------------------------|--------------------------|
| شاہ اورنگ زیب عالمگیر           | سکہ زرد در جہاں چو بدر منیر       | سکہ اورنگ زیب :-         |
| بادشاہ کام بخش دین پناہ         | در دکن زرد سکہ بر خورشید ماہ      | کام بخش حاکم بیجا پور :- |
| بادشاہ مالک اعظم جہاں           | سکہ زرد در جہاں بدولت شاہ         | اعظم حاکم گجرات :-       |
| ابوالفتح غازی جہاندار شاہ       | در آفاق زرد سکہ چوں ہر ماہ        | جہاندار شاہ :-           |
| بادشاہ بجزوہ فرخ سیر            | سکہ زرد از فضل حق بر سیم وزر      | فرخ سیر :-               |
| شہہ شیکو سیر تیمور ثانی،        | بہ زر زرد سکہ صاحبقر آنی،         | سیر (تیمور شاہ ثانی) :-  |
| شاہنشاہ بجزوہ رفیع الدرجات      | زرد سکہ بہ ہند باہزاراں برکات     | رفیع الدرجات :-          |
| بادشاہ زمان محمد شاہ،           | سکہ زرد در جہاں ز لطف الہ         | محمد شاہ :-              |
| عزیز الدین عالمگیر ثانی،        | بہ زر زرد سکہ صاحب قرانی          | عالمگیر ثانی :-          |
| حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ   | سکہ زرد بر صفحہ کشور سایہ لطف الہ | گوہر (شاہ عالم ثانی) :-  |
| چراغ دودہ تیمور اکبر ثانی       | بہ سیم وزر زرد سکہ جہان بنائی     | تیمور شاہ ثانی :-        |
| سراج الدین ابوظفر شاہ بہادر شاہ | بہ سیم وزر زرد سکہ پفضل الہ       | ابوظفر :-                |

قارئین نگار کے اصرار پر ”خدا نمبر“ شائع ہو گیا۔ خدا کیا ہے؟ خدا کا تصور کب اور کیسے ہوا؟ مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدن انسانی پر کیا اثر ڈالا؟ ہندو اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اس تعلق کی تعبیر کس کس انداز میں کی گئی ہے؟ انبیاء کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے تعلق کیا ہیں؟ ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے؟ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے؟ اس قسم کے اور بہت سے اہم سوالات ہیں جس کا جواب بجز ”خدا نمبر“ کے آپ کو کسی کتاب میں نہیں ملے گا۔

قیمت :- پانچ روپے

نگار پاکستان ۳۳ گارڈن مارکیٹ کراچی نمبر ۳



# فراق کی شاعری کی کہانی

(خود ان کی زبانی)

(فراق گورکھپوری)

انگریزی تہذیب کے فقرے سے ہم بجا طور پر مغربی تہذیب مراد لیتے ہیں۔ یعنی یورپ اور امریکہ کی تہذیب۔ ایشیا پر اور خاص کر ہندوستان اب سے دو سو برس پہلے اس مغربی تہذیب و تمدن کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا جس کی نمائندگی انگلستان کر رہا تھا۔ منفی پہلو یا منفی پہلو کے پردے پر ایک اثباتی پہلو اس کا اثر یہ تھا کہ شخصی حکومت اور سامنتی مشرقی تہذیب و تمدن کے تصور کا ہمارے ذہنوں پر تسلط کمزور پڑ گیا۔ دوسرا اثر انگریزی حکومت نے شعور پر ڈالادہ شینی دور کی عظمت و اہمیت کا تصور تھا۔ اسے سوا سو برس پہلے ریل، دھانی جہاز، چھپے خلیے، مغربی تمدن و طرز حکومت کے کئی ادارے اپنے وجود کی پرچھائیاں ہمارے خارجی اور داخلی زندگی پر ڈالنے لگے۔ تہذیب و تمدن کا ایک پورا دھم سے الوداع کہہ رہا تھا اور ایک دوسرا دور ہم سے اپنا استقبال اور خیر مقدم کر رہا تھا۔ اب مغربی علوم بھی ہماری ذہنی زندگی اور ہمارے شعور میں داخل ہونے لگے۔ اور ہماری قومی نفسیات کا جزو بننے لگے۔ عظیم مفکر مارکس نے ۱۸۵۳ء میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ انگریز ہندوستان میں تاریخ غیر شعوری اور غیر ارادی آلہ کار ہیں۔ المختصر اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے نمایاں طور پر ہندوستان ایک نیا ہندوستان بننا شروع ہو گیا تھا۔ یہ رد و بدل یا انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سے نمایاں سے نمایاں تر ہونے لگا۔

میں تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میرے دادا کی جوانی تھی اور میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت بھی ابھی ۱۸۵۷ء میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ اس کے دو برس بعد پیدا ہوئے۔ سیلاب مغربیت کے پہلے ریلے میں والد مرحوم کا بچپن اور ان کی جوانی نشوونما کی منزلوں سے گزری۔ اس ہندوستان کی تمام زبانوں اور ان کے ادب پر ایک نئے ادب اور مختلف ادب اور اس کے نظریوں اور مقاصد کی اثر اندازی شروع ہو کر پڑھتی چلے جس دعوے سے آزاد دھانی، تیر احمد اور شبلی کا تعلق تھا اس دور کی دہائی میں میرے والد کی شاعری نے آنکھیں کھولیں انھوں نے بہت حسیہ زاویے اور بہت لطیف انداز سے اپنی اردو نظموں اور غزلوں میں انگریزی ادب کا اثر لیا اور اس کا تتبع کیا۔

میری شاعری ابتداء میں اردو کی روایتی غزل گوئی کی پسندیدہ مثالوں سے متاثر رہی۔ یہاں ایک قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ انگریزی تہذیب ادب کا ایک اثر اردو ادب پر اس انداز سے پڑنے لگا تھا کہ اردو شاعری کے ابتدائی ادوار سے بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی تک کے اردو ادب کا جو حتمہ اصلیت سے مملو تھا اور جس پر دور ناسخ کے بعد سے ایک پردہ پڑ گیا تھا۔ اس حصے کا از میر نو نشاۃ الثانیہ ہونے والا میرے والد جہاں گھر ملی صحبتوں میں عالی اور آزاد کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہاں غالب، نظیر اکبر آبادی اور انیس کی عظیم ادبی خدمات کو بھراہتے تھے۔ میں خود عنفوان شباب میں شدید جنسی جذبات اور جنسی ناکامیوں کی مسلسل تڑپ اور اضطراب کا شکار رہا اور یہ کیفیت کوئی چیز بھتی جو کوئی گئی ہو کر رہ جائے۔ کم و بیش چالیس برس تک مجھے یہ کرب انگیز کیفیت اپنی گرفت میں لے ہوئے تھی، خیریت گزری کہ میر جنسیت کی ہائے وائے تک اپنی خارجی و داخلی زندگی کو محدود نہیں رکھا۔ دنیا کے علوم، ہندوستانی اور عالمی کلچر اور دنیا کے انسانیت اور



ساتھ ہی ساتھ آفاقی ادب کی کشش اور ان کے مضامینات و مقاصد بھی مجھ پر مسلط رہے۔ مفلوج و مجہول ہو کر بھی میں نے اپنے کو مفلوج و مجہول نہ ہونے دیا۔ اپنے زخمی اور نیم شکستہ بال و پر کے باوجود اپنا ذوق پر داز جہاں تک ہو سکا میں نے محفوظ رکھا۔

ہاں! تو میری شاعری کا کم و بیش تین چوتھائی حصہ عشقیہ شاعری یا عشقیہ غزل گوئی کے لئے وقف رہا اور اس عشقیہ شاعری کو میں نے آفاقی کلچر اور ہندوستانی کلچر کی بلند ترین ردائوں سے مہذب بنانے کی کوشش عمر بھر یا نصف صدی تک جاری رکھی۔ میری غزلوں میں خارجی طور سے یا براہ راست ادھار یا مستعار لینے کے انداز سے انگریزی شاعری کا اثر نہ ملے گا لیکن انگریزی شاعری کا گہرے شعور اور ادب کا لہجہ یا طرز احساس ایک جاڑی و ساری اور تحلیل شدہ عنصر یا اثر کی شکل میں ملے گا۔ میرے شعور کی مخصوص آواز اور اس کے پس منظر کی تخلیق میں اور اس کے نشوونو میں جہاں قدیم ہندوستان کے ہندو ادب کا طرز فکر کا رفر مار رہا ہے وہاں بہترین اردو اور فارسی شاعری کی نعمت اور اس شاعری کی اقدار کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا انداز فکر بھی ملتی ہے جس کی شکل میں کام کرتے رہے ہیں۔ یہ سب سہی! لیکن میں نے اپنی غزل گوئی میں ایسی باتیں نہیں کہنے دی کہ اردو غزل گوئی کی بہترین اور لطیف ترین روایات کے اجنبیت یا غیریت یا ناہم آہنگی کا احساس میرے ان اشعار میں نظر آئے جن میں اور عناصر و اثرات کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعری کے عناصر و اثرات بھی تعمیری و تخلیقی حیثیت سے شامل ہوں۔ شاعری ایک گاہے شب آراں "ہے جہاں" لے سانس بھی آہستہ "کہ قانون جاری ہے۔ اردو شاعری کے علاوہ کسی بھی شاعری یا تہذیب کے اثرات کو اپنی غزل گوئی میں سمیٹتے وقت مجھے اس احتیاط سے کام لینا پڑا ہے کہ اردو غزل کی روایتوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ نئے پن کو پڑانے پر سے ہم آہنگی کے بغیر تخلیقی جدت کامیاب نہیں ہوتی۔ اسی اصول کو میں نے برابر ہمیش نظر رکھا ہے۔ ایک نکتہ اور بھی بہت اہم اور قابل توجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر زبان اور ہر قوم بلکہ ہر دور کے شعر و ادب کا ایک حصہ آفاقی اور عالمگیر ہوا کرتا ہے اور یہ حصہ مقامی و مخصوص نہیں ہوا کرتا بلکہ انسانیت کی وحدت کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ اردو ادب میں بھی صد ہا اشعار ایسے مل جاتے ہیں جنہیں محض مشرقی شاعری کہہ کے ٹالا نہیں جاسکتا بلکہ چھوٹیں آفاقی شاعری کہنا پڑتا ہے۔ اردو شاعری کے ایسے اشعار سنسکرت شاعری، یونانی شاعری، لاطینی شاعری اور مغربی کی موجودہ زبانوں کی شاعری، منجملہ جن کے انگریزی شاعری بھی ہے۔ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ میری زندگی اور میری شاعری کے ارتقاء میں وہ دور آگیا تھا کہ اردو ادب کے عالمگیر اشعار کی آفاقیت کو پہچان لوں۔ ایسے اشعار سے شعوری یا تحت الشعوری طور پر متاثر ہو کر مجھ سے ایسے متعدد اشعار ہوتے رہے جو انگریزی ادب کے آفاقی اشعار کی دھڑکنیں اندر رکھتے تھے۔ آفاقی ادب کی صد ہا اقدار مشترک اپنی شاعری میں سمونا اور ساتھ ساتھ اپنی شاعری کے خدو خال کو مسخ ہونے یا بگڑنے سے بچا لینا ہر ذمہ دار شاعر کا فرض ہے۔ دنیا کا ایک عالمی انسانی مشترکہ تہذیب و ادب کی طرف گامزن ہے۔ اردو شاعری بھی گزشتہ کم و بیش نصف صدی سے مقامیت یا محض مشرقیت کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو رہی ہے۔

انگریزی شاعری کا ایک نہایت رچا ہوا مذاق فطرت پرستی (Nature worship) یا مناظر قدرت سے والہانہ عشق و آہ اور ادب میں ہم کو آپ کو نیچر یہ شاعری تو ملتی ہے لیکن یہ شاعری رسمیت یا محض شعوری سے آگے نہیں بڑھتی۔ نیچر کی رمزیت، انسانی زندگی اور خواب زندگی سے مناظر قدرت یا مادی کائنات کی ہم آہنگی یا زندہ رشتے کی مثالیں مجھ سے پہلے اردو شاعری میں بہت کم ملتی تھیں۔ انسانیت کا محض انسانیت ہو کر رہ جانا اسے انسانیت سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ زمین، دریا، سمندر، پہاڑ، جنگل، وادیاں، موسموں کا جلوس، فلکیات اور قدرت کے تمام مظاہر جانوروں کی زندگی، یہ سب ایسے حقائق ہیں جن سے انسان کو ہم آہنگ ہونا ہے اور جن کے لئے پرستارانہ جذبات و احساسات کو اپنے شعور میں پروار دینا تہذیب کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ میں نے اپنی غزلوں میں جو تمنائی صدی سے اکثر اپنے اشعار کہے ہیں جن میں انسان کی عشقیہ اور غیر عشقیہ زندگی یا عام زندگی کی فطرت سے ہم آہنگی کی طرف رنگارنگ اشارے ہیں۔



اب میں کچھ زیادہ نہ کہہ کر اپنی غزلوں کے چند اشعار پیش کئے دیتا ہوں جو روادری میں اس مضمون کے دوران تحریر ہیں مجھے یاد آتے ہیں

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بستی ہے امیدواروں میں نئی موت بھی لذت آئی  
کہاں ہر ایک سے بارشِ طاقٹھا ہے کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی  
خلوتِ راز میں فقط ہم تم ایک کمرے کو کائنات کریں

And make one little room and everywhere. John Donne.

فننا تبسم صبح بہار تھی لیکن پیو بچ کے منزلِ جاناں پر آنکھ بھرائی

موت اک گیت رات گاتی تھی زندگی جھوم جھوم جاتی تھی

زندگی کو دغا کی راہوں میں موت خود روشنی دکھاتی تھی

ہر عقدہ وقت پر بشر کھول رہی ہے

ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے

آواز مری گیسو نے شب کھول رہی ہے

کچھ نفیس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا کچھ فننا کچھ سیرت پر داز کی باتیں کر دو

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آسے کے رہ گئیں

یہ نکبتوں کی نرم ردی یہ ہوا یہ رست یاد آرہے ہیں عشق کے ٹوٹے تعلقات

دیکھ جب عالم یہ ہے حسن خمار آلود کا صبح کو لیتی ہو جیسے کائنات انگرہائیاں

زلفوں کے خشک سائے میں سکون پا جاتی ہے میری طبعِ دل یوں جیسے نیم شبی گنگا کروٹ لے کر سو جاتی ہے

کیفِ بردوشِ بادلوں کو بے خبر تو کچل نہ جائے کہیں

ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا ہو

وہ سوچتا ہوا بدنِ خود اک جہاں لئے ہوئے

"Her pure and eloquent blood spoke in her cheeks, and so distinctly wrought that one might almost say, her body thought."

— John Donne

دکھاتے ہیں ستارے ایک بہتر زندگی کا خواب نہ دیکھ ان کی طرف وہ چھین لیں گے سب خوشی تیری

کبھی پچھلی رات کو دیکھ کے کسی سانس لیتے چراغِ نو

کہ غزل ہوئی تو شعور میں وہی خستگی ہے وہی تھکن



مری ہر غزل کو یہ آرزو مجھے سچ سچا کے نکالے  
 مری فکر ہو ترا آئینہ مرے نغمے ہوں ترے پیر من  
 کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے راز عالم خیر و شر  
 کہ میں رہ چکا ہوں ادل ہی سے گے ایزد و گے اہرن  
 جسے دس لیا ہو زمانے نے کوئی زندگی ہے وہ زندگی  
 یہ سواد شام اجل نمایہ ضیائے صبح کفن کفن  
 یہ اداس اداس بھی بھی کوئی زندگی ہے فراق کی  
 مگر آج کشتِ سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن  
 اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہو گئی ہے  
 جس شے پہ نظر پڑی تیری تصویر حیات ہو گئی ہے  
 وہ تیری نرم دوشیزہ نگاہیں دل نہیں بھولا

پڑی جب جب نظر تیری نگاہ ادلیں نکلی  
 اب نہ دور آسمان ہے نہ دور حیات ہے  
 کون یہ لے رہا ہے انگریزائی  
 آسمانوں کو نیند آتی ہے  
 حسن اک خواب ناز ہے جس کے  
 چمنک پڑنے کو عشق کہتے ہیں  
 شام کے سائے گھلے ہوں جس طرح آوازیں  
 ٹھنڈکیں جسے کھلتی ہوں گے کے ساز میں  
 حسن کی نرمیوں نے لوشے دی  
 مسکراتا ہے یاد مجھے  
 جب جب آئے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے  
 انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری  
 وہ عالم ہوتا ہے مجھ پر جب فکر غزل میں کرتا ہوں  
 خود اپنے خیالوں کو ہدم میں ہاتھ لگاتے درتا ہوں  
 جب ساز غزل کو چھوٹا ہوں راتیں لو دینے نکلتی ہیں

ظلمات کے سینے میں ہدم میں روز چراغاں کرتا ہوں  
 تیرا دھال بڑی چیز ہے مگر اے دوست  
 دھال کو مری دیکھئے آرزو نہ بنا  
 لطف و ستم، وفا جفا، یاس و امید، قرب و بعد  
 عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں  
 فراق رات گئے یہ نوائے نیم شبی  
 جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی  
 خستگی ہر دو ماہ کی مست پوچھ  
 کون پیمانہ ہے جو چور نہیں  
 کیا کریں ہم بھی کیا کرو تم بھی  
 آدمی آدمی کا دشمن ہے  
 یہ نرم نرم ہوا جھللا رہے ہیں چراغ  
 ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں باغ  
 جب چپ کے تاروں کی آنکھ سے پاؤں ہنستا  
 اسی کے نقش کف پا سے جل اٹھتے ہیں چراغ



کہ جیسے نیند میں ڈوبنے والے پہلی رات چلے  
پرچم حسن اک ذرا خم ہے  
میں نے دیکھی جس خیالوں کی بھی انگلیں پر خم  
جو جوم جوم زبوں سب اواسیاں تیری  
چلتی پھرتی ہیں مرے سینے میں جبر چھپا لیا  
جب ان کو پیار کیا بس نے جن سے پیار نہیں  
ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں  
ہر باں نامہر باں کیا کیا سمجھ بیٹھتے ہم  
افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے  
ہر طرف پر چھائیاں پر چھائیاں  
سوچ لیں اور لدا س ہو جائیں

دلوں میں داغ محبت کا اب یہ عالم ہے  
بگڑ گیا عشق آج دنیا سے  
پوچھ مت کیفیت قلب دم فکر سخن  
یہ دکھ یہ رنج یہ آزدہ حالیاں قیری  
پوچھ مت کیفیتیں ان کی پوچھ ان کا شمار  
ترافراق تو اس دن ترافراق ہوا  
کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے  
حسن کو ایک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق  
جو ہونٹوں تک ترے محدود ہوتی ہے سحر ہوتے  
دیکھ آئے آج یادوں کا نگر  
زندگی کیلئے کج اے اے دوست

"where but to think is to be full of sorrow" Keats

رُخ ہستی سے چادر سی مگر سر کاٹی جاتی ہے  
بات وہ کہہ اے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے  
وہی سن ہے ترے حسن کا نشین ہے  
کئی بار تو عشق کیا ہے موت کے منہ میں جان بچانے  
ایک شب غم کی سوراتیں، ایک محبت سو افسانے  
آہ اب تجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں

بہت آہستہ اٹھتی ہے نگاہ شاعر فطرت  
دب بایدا کرے دلوں میں ایمانوں کو دے ٹکرا بنے  
جو ہنسی چھاؤں میں غموں کی پنکھڑی سے بنے  
امن داماں کی دنیا میں بھی ایسوں کو کب مٹے ہیں ٹھکانے  
اسی سے دنیا غافل اسی درد کا گھر گھر چرچا  
ہر بانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست

"Love is not amity" Francis Thomson

رات کتنی نہیں جدائی کی  
کون ہے صبح ازل سے خراماں  
گنگنا تا ہو جیسے اک مردہ  
نویں نکبہ کے چرخ غور کا جھلملائی ہوئی  
دکھتے روپ کی دیپا دلی جلائی ہوئی  
دو چپ تیرے قدم کی سنی سنائی ہوئی  
وہ بھروسہ تری بیداریوں کی گائی ہوئی  
دل لگی کسی مٹتے ہوئے نظام کی یاد  
جو کائنات کے آشکوں میں ہے نہانی ہوئی  
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محو خواب نہیں

کوئی افسانہ چھپڑ تنہائی  
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا  
چاند اک گیت رات کا تا سوتا  
رگیں زریں کے مناظر کی پڑچلیں دھیلی  
ہنوز رقت کے سینے میں جگر گماست ہے  
ہنوز رقت کے کانوں میں جھم جھماہٹ ہے  
وہ خواب گاہ میں شعروں کی کروٹیں دم صبح  
حیات عشق ندیم آخری زمانے میں  
پہونچ سکے گی بھی تجھ تک مری نولے فراق  
زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل



خراب حال بھی اچھی طرح خراب نہیں یہ ہے عذاب جہنم کہ وہ عذاب نہیں

"Held in uncertainty" Bernard Shaw

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے تری نگاہ کرم کا گھما گھنسا یہ

حاصل حسن و عشق بس اتنا آدمی آدمی کو پہچانے

بہار غنچہ بہ غنچہ چمن میں آتی ہے قدم قدم پہ چھلکتا ہے رنگبختہ گری

"And Blossom by blossom the spring arrives." ..... Swinburn

مکئی زندگی میں کبھی صبح لو کی تازہ دی شور پر نہ رسوم و قیود کا تھا شمار

"And custom lie on thee Heavy as frost and deep almost as life"

Wordsworth

اس طرح کے اتنے اشعار میری غزلوں میں مل جائیں گے جن سے ایک مختصر دیوان مرتب ہو سکتا ہے یا جن کی تعداد ایک ہزار اشعار سے بھی زیادہ تک پہنچے گی۔ کچھ آگے کہنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری تمام کی تمام غزلوں، رباعیوں اور نظموں پر محض انگریزی یا عربی شاعری کا اثر یا اس کی پرچھائیاں نہیں ہیں۔ فارسی اور اردو شاعری کی بہترین روایتوں پر میں نے اپنی شاعری کی عمارت تعمیر کی ہے۔ یہ بات یا اجتہاد کو زندہ اور مسلسل روایت سے میں نے ہم آغوش و ہم آہنگ رکھا ہے۔ منقولہ بالا اشعار میں دو چار کو چھوڑ کر بقیہ تمام اشعار نے اپنی غزلوں ہی سے منتخب کئے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں کہ انگریزی شاعری کے طرز احساس و طرز بیان کا جو پر تو میرے ان اشعار اور میرے ہی صدہا اشعار پر پڑ رہا ہے اس کا اندازہ یا اس کی پرکھ صرف انگریزی دلائل و حقائق کو ہو۔ نہایت محبت و خلوص اور احترام کے ساتھ اس کے بہت سے نوجوان ہم عصروں نے مجھ سے کہا ہے کہ ہم لوگ یہ باتیں کہاں سے لائیں۔ ان کے لئے تو انگریزی شاعری سے استفادہ بالآخری ہے۔ ایک بات اور اس دوران گفتگو میں عرض کر دوں۔ وہ یہ ہے کہ اردو، فارسی اور عربی شاعری میں ایک چیز کی کمی رہی اور وہ چیز ہے فضا آفرینی جس کی بہترین مثالیں سنسکرت شاعری، یونانی شاعری اور انگریزی شاعری میں مختلف انداز اور مختلف صورتوں میں ملتی ہیں۔ میرے یہاں ایسے اشعار کی تعداد بہت بڑی ہے جن میں یہ فضا آفرینی اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔ دوسری صفت جسے ہم لحاظ سے روح شاعری کہہ سکتے ہیں اور جو فارسی اور عربی شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے وہ صفت ہے جسے ہم خوابناکی کہہ سکتے ہیں جو ہمیں انسانیت کے اس درد ادیس کی طرف لے جاتی ہے جب جادوگری کی آغوش میں یا منتر جگانے کے عمل میں قدیم ترین شاعری نے جہنم آج ہم جسے کیفیت کہتے ہیں اور جس کی کمی اردو شاعری میں نہیں ہے وہ اس خوابناکی کی ذرا اتاری ہوئی منزل ہے۔ انگریزی شاعر درڈز ورتھ

"The light that never was on land or sea."

The Consecration and the poet's dream."

انگریزی شاعری سے جہاں میں نے بہت کچھ حاصل کیا وہاں خوابناکی کے ٹھکانے بھی اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مغربی ادب اور انگریزی شاعری کا اثر میری شاعری پر یوں نہیں پڑا کہ صدہا یا ہزار ہا انگریزی نثر و نظم کے جملے یا مصرعے یا حارکات میں نے اردو میں ترجمہ کر دیا ہو۔ اگرچہ میری پوری شاعری میں کچھ انگریزی کی نظموں اور اشعار کا ترجمہ بھی مل جائے گا لیکن بیسیا کر فی کرچکا ہوں ایک فضا یا آب و ہوا یا مخصوص طرز احساس و طرز بیان کی شکل میں انگریزی شاعری کا اثر میری شاعری میں سے نکال دیا۔ یہ فضا



بسا اوقات میرے انفرادی جمالیاتی احساس اور ہندوستانی اور آدیشوں سے پیدا شدہ فضا یا خود فاری دار دور دایات کی فضل سے اسے بل جل گئی ہے جیسے کسی آد میں مختلف رنگ شعاعی (Spectrum) کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہ آد میری آواز ہے جس میں رنگا رنگ گونج یا بازگشت آوازیں بسا اوقات تھر تھراتی اور جھللاتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ہم چاہیں تو اس مشترکہ اثر سے پیدا شدہ رنگ شاعری کو ایک قوس سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں جس میں سات رنگوں کی پھوار نظر آتی ہے۔

اپنی شاعری کے آغاز میں یعنی ۱۹۲۰ء ۱۹۲۲ء کے زمانے میں میں نے تین انگریزی نظموں کے ترجمے کئے جن میں دو روح کا نسا میں شامل ہیں۔ ایک نظم ماس ہارڈی کی ہے جو ان کے شہرہ آفاق ڈائنامکس سے لی گئی ہے اور دوسری نظم کے مصنف کا نام اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے۔ اس دوسری نظم کا اردو ترجمہ عشق اور موت کے عنوان سے روح کائنات میں شامل ہے۔ طوالت کے خوف سے اس دوسری نظم کے صرف پہلے چھ مصرعوں کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

ایک پرانے کمرے میں      ہلکی ہلکی روشنی تھی  
تم بیٹھے تھے جہاں گویا      ایک تصویر حیات کی تھی  
اور حیات کے عاشق کی      موت اک نغمہ گاتی تھی

ہارڈی کی نظم کا ترجمہ کرنے میں میں نے یہ کوشش کی کہ ہر چھوٹے بڑے مصرعے کی بحر میں اور قافیوں کی ترتیب میں اصل انگریزی کا پرتو آجائے تیسری نظم جو نگار میں شائع ہوئی تھی ایسی برائی کی انگریزی نظم (The Prisoner) کا ترجمہ تھا اور افضل انگریزی کی بحر کا پرتو اردو ترجمے میں بھی نظر آئے گا۔

شیلی کی مشہور نظم Ode to The west wind سے میں بہت متاثر رہا ہوں نتیجے کے طور پر میری نظم "ترانہ خزاں وجود" آئی جس کے کئی مصرعوں میں اصل انگریزی نظم کے ٹکڑوں کی آواز بازگشت سنائی دے جائے گی۔ اب سے اندازاً پینتالیس سال قبل انگلہ کی متصوفانہ نظموں کا ایک ضخیم مجموعہ The Oxford book of English Mystical verse میرے مطالعہ مرکز موضوع رہا۔ "روح کائنات" میں روح کائنات ہی کے عنوان سے میری جو نظم شامل ہے اس میں اس کتاب کے اثرات جا و ساری ہیں، یوں تو اس نظم کا نام میں نے "نغمہ حقیقت" رکھا تھا اور اس کا آغاز بھگوت گیتا کے ایک باب کے اردو ترجمہ سے ہوا لیکن جب یہ نظم آگے بڑھی تو تصوف کے وہ حقائق جو مذکورہ بالا انگریزی کتاب سے میرے اندر پیدا ہوئے تھے۔ اس نظم میں جلوہ ہونے لگے۔ تصوف کا موضوع ماضی و حال اور مشرق و مغرب کے ادب و ثقافت کو ایک مرکز پر لے آتا ہے۔ اس لئے میری یہ نظم اردو حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں کے متضاد و متضادم اجزاء کی وحدت کو اس نظم میں پیش کیا گیا ہے۔ اب سے بیس برس پہلے میں نے روپ کی رباعیاں کہنا شروع کیا تھا پہلی ہی رباعی میں جو مصرعہ بہت مشہور و مقبول ہوا یعنی شگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے ہیر پاک کے اس فقرے کا

"I Touch the boundaries of music"

روپ ہی کی ایک رباعی کے دو مصرعے یوں ہیں۔

جب تاروں نے جگمگاتے نیرنے تو بے  
جب شبہم نے فلک سے موتی رو بے



یہ مصرعے پر تو ہیں انگریزی شاعر ملیک کے مندرجہ ذیل مصرعوں کے۔

"When the stars threw down their spears  
And watered heaven with their tears"

ٹی۔ ایس۔ ایلینٹ نے ایک بہت گہری بات کہی ہے کہ ہر شاعر میں بربریت کے زمانے سے آج تک تہذیب میں انسانیت کے لئے ادوار گزر رہے ہیں سب مرکوز ہو جاتے ہیں۔ اب یہ رباعی دیکھئے۔

لے میں مری گو نختلے سورج منڈل میرے سوزدروں میں من کر ہوئی حل  
دنیا میں جب آدمی نے آنکھیں کھولیں اس وقت سے آج تک کی تاریخ ملن

ایڈورڈ کارپنٹر نے لکھا ہے کہ ہر سچے عاشق کو یہ حق پہونچتا ہے کہ اپنے آپ کو وہ ایک دیوتا سمجھے۔ اس خیال کا پر تو مندرجہ ذیل رباعی میں نظر آئے گا۔

پینمبر عشق ہوں سمجھ میرا مقام صدیوں میں پھر سنائی دے گا یہ کلام  
وہ دیکھ کہ آفتاب مجدے میں گرے وہ دیکھ اٹھے دیوتا بھی کرنے کو سلام

انگریزی شاعر دان (Vaughan) کا مشہور مصرعہ ہے۔

"I saw eternity like a ring of light"

کا ترجمہ میری اس رباعی میں ہو گیا ہے۔ اک حلقہ نور تھا ابد کا منتظر  
تا حد نظر سلسلہ موجودات ہر شے سے ابھر رہی تھی تقدیر بشر

ی مصرعہ میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے وہ کسی نظم سے مستعار نہیں ہے۔

ایک ادب پر دوسرے ادب کا اثر یہ ضروری نہیں ہے کہ غلامانہ تقلید یا ترجمہ ہی کی شکل میں اردو نہا ہو۔ جب ایک ہی ادب کے عظیم فن کار کا اثر دوسرے عظیم فن کار کے کلام پر مستقل طور پر پڑتا ہے تو دونوں کے لب و لہجہ کی یکسانیت اور انداز احساس کی مماثلت ان سے پہچانی جاسکتی ہے۔ جیسے انیس کا رنگ چکبت کے مسدس میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح ایک دور شاعری یا ادبستان عری کے مختلف شاعروں کے کلام میں ہم آہنگی و یکسانیت سنائی اور دکھائی دے جاتی ہے۔ میری شاعری میں مصحفی کا رنگ مومن رنگ، آتش کا رنگ بسا اوقات نظر آئے گا۔ لیکن میری غزلوں کے ایک معتد بہ حصے پر جس طرح میر کا رنگ تہ درتہ اور آئینہ در آئینہ آجائے گا وہ میر کے ہم عصروں سے لے کر آج تک کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہ آئے گا کیونکہ میر کے احساس، میر کا وجدان اور کی آواز میرے خون میں حل ہو کر رہ گئے ہیں۔ انگریزی شاعری کا اثر اردو شاعری پر مختلف سطحوں سے پڑا ہے اور یہ اثر جتنا ہی کامیاب تھا اسی قدر یہ بتانا مشکل ہو جائے گا کہ اس کا سرچشمہ کیا ہے۔ چند باتوں سے اس اثر کی نشان دہی ہوتی ہے معمولی نشان دہی تو موضوعات انتخاب سے ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ اہم ہے الفاظ اور فقروں کی ساخت۔ تشبیہوں اور استعاروں اور تعبیروں کی وہ کائنات اس اثر کی نشان دہی کرتی ہے جس کائنات سے انگریزی شاعری کی کائنات ملتی جلتی نظر آتی ہے۔ انگریزی ادب کا مطالعہ میں نے بہت پر خلوص اور حساس طریقے سے کیا ہے اور انگریزی شاعری کے جواہر پارے مجھ میں ایک سپردگی اور مکمل ہم آہنگی کا عالم پیدا کرتے ہیں۔ یہ سپردگی و ہم آہنگی جتنی گہری اور جتنی مکمل ہوگی اتنا ہی انگریزی شاعروں کا اثر میری شاعری پر بھرپور نظر آئے گا اور یہاں تک کہ میں نے لگے گا گویا انگریزی شاعری کی روح نے اردو شاعری کا چولا دھار لیا ہے۔ انگریزی شاعری کا حقیقی و مرکزی لب و لہجہ



اس بحر (Metre) میں نظر آتا ہے (Lambic Pentametre) کہتے ہیں اور جس کے دس اور کئی ہجڑے ہوتے ہیں یہ بحر مقفی اور غیر مقفی دونوں طریقوں سے انگریزی شاعری میں کثرت سے استعمال کی گئی ہے۔ پہلے مقفی طور پر احسن انگریزی اس کی ایک مثال دیکھیں:-

"The one remains the many change and Pass  
Heaven's light for ever shines, earth's shadows fly,  
Life like a dome of many-coloured glass  
Stains the white radiance of eternity" - (Shelley)

غیر مقفی صورت یعنی بلینک در کس کی صورت میں اس بحر کی ایک مثال دیکھئے:-

There drew he forth the excalibur,  
And over him drawing it, the winter moon.  
Brightening the skirts of long cloud ran forth,  
And sparkled keen with frost against the hilt,  
For all the haft twinkled with diamond sparks,  
Myriads of topaz lights and jacinth work of  
subtlest jewellery.

شیکسپیر کے تمام المیوں اور ملٹن کی فردوسِ بخشیدہ یا بازیافتِ فردوس اور انگریزی شاعری کے اہم ترین کارناموں کی معر فی صدی ہی بحر ہے، میرے وجدان میں یہ بحر قریب قریب نصف صدی سے رچ گئی ہے۔ اردو کی جو بحر مجھے اس انگریزی بحر سے قریب محسوس ہوئی اس کی مثال میرا ہی یہ شعر ہے:-

نہ ذکر موج فنا کر غم کے بیتردوں کو گداز سینہ ساحل ڈبو چکا کب سے

معر فی یا غیر مقفی شکل میں، میں ایک مدت تک اس فکر میں تھا کہ اردو میں کوئی ایسی نظم کہوں جو صوتیات کے لحاظ سے انگ بلینک درس کی اس بحر سے ہم آہنگ ہو۔ برسوں کی خاموش کاوش کے بعد میری وہ نظم رونما ہوتی ہے جس کا عنوان ہے "آدھی را اگرچہ یہ نظم نیم ارادی طور پر کہیں کہیں مقفی ہو گئی ہے۔ اس کے دو اقتباسات پیش کرتا ہوں:-

سیاہ پیر ہیں اب آپ اپنی پر چھائیں زیں سے تاملہ وانجم سکوت کے مینار

جدھر نگاہ کریں اک اتقاہ گم شدگی اک ایک کر کے فسرہ چراغوں کی پلکیں

جھپک گئیں جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں جھلک رہا ہے پراچاندنی کے درپن میں

ریسے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب فلک پہ تاروں کو پہلی جماہیاں آئیں۔

لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی

سکوت نیم نشی کی حدیں نہیں ملتیں!

گلوں نے چادرِ شبنم میں منہ لپیٹ لیا

ذرا بھی سنبھل تر کی لٹیں نہیں ہلتیں



اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلے میں  
سکوت نیم شبی ہے انہیں کے پاؤں کی چاپ کچھ اور جاگ اٹھا ادھی رات کا جادو  
دوسری نظم کا عنوان 'پرچھائیاں' ہے جس کے صرف دو اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔ پہلے یہ نظم، دھندلکا، کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

یہ شام اک آئینہ نیلگوں، یہ نم، یہ مہک  
دہ کچھ سلگتے ہوئے کچھ سلگنے والے آواز  
لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی  
قریب دور یہ گو دھول کی ابھرتی گھٹائیں  
یہ نیم تیرہ فضا روز گرم کا تابوت  
یہ منظر کی جھلک، کھیت باغ، دریا، گاؤں  
سیاہیوں کا دبے پاؤں آسمان سے نرول  
پرانے وقت کے برگد کی یہ اداس جٹائیں  
یہ کائنات کا ٹھنڈا، یہ اٹھاہ شکوت  
دھواں دھواں سی زمیں ہے گھلا گھلا سا فلک

کسی خیال میں ہے غرق چاندنی کی چمک  
حیات و موت میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں  
سیاہ لیسوؤں کے سانپ نیم خوابیدہ  
ہو ایں نیند کے کھیتوں سے جیسے آتی ہوں  
کردوں سال کے جاگے تارے نم دیدہ  
یہ پچھلی رات، یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک

جن دو نظموں کے اقتباسات آپ نے دیکھے وہ ہماری دنیا کے شاعری میں بہت مقبول ہوئیں۔ ان نظموں کی تخلیق کا زمانہ ۱۹۶۴ء - ۶۵ء ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اردو شاعری میں غیر مقفی نظم رونما ہو رہی تھی۔ مجھے یہ جان کر غیر معمولی اطمینان ہوا کہ بلند ترین تنقیدی حلقوں میں ان نظموں کو اردو کی غیر مقفی شاعری کا بلند ترین نمونہ قرار دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ جہاں تک یہ نظمیں پہنچی ہیں یا جن مقامات کو ان نظموں نے مس کیا ہے وہاں تک اردو شاعری آج تک پہنچ نہیں سکی تھی۔ پطرس مرحوم نے مجھے یہ نظمیں ریڈیو سے نشر کرتے سنا تھا اور والہانہ انداز میں ان کی داد دی تھی۔ جگر مرحوم نے ٹھیٹھ غزل گو شاعر ہوتے ہوئے ان نظموں میں بظاہر غیر متوقع انداز میں بالکل اچانک طور پر بادی النظر میں بے تعلق باتوں اور مصرعوں کے متعلق یہ کہا تھا کہ ان نظموں کی یہی خصوصیت جان نظم ہے۔ علی سردار جعفری نے بھی ان نظموں کا غیر معمولی اثر لیا تھا۔ اب اسے کیا کروں کہ لوگ اس امر کے درپے ہیں کہ فراق صرف شاعر غزل ہے۔

مضمون کسی قدر طویل ہو گیا ہے اس لئے بہت سی مثالیں اور بہت سے نکات چھوڑ کر صرف ایک اور نظم سے چند ٹکڑے پیش کروں گا۔ یہ اقتباس اپنی نظم "جگنو" سے پیش کرتا ہوں۔

یہ مست مت گھٹا یہ بھری بھری بوسات  
فضائے شام میں دورے سے پڑتے جاتے ہیں  
دیک اٹھا ہے طرادت کی آغ سے اکاش  
یہ بد بھری ہوئی چروائیاں سنکتی ہوئی  
تمام - حد نظر تک - گھلا دٹوں کا سماں  
جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اٹھتا ہے  
زفرش تافلک انگڑائیوں کا عالم ہے  
جھنجھوڑتی ہے ہری ڈالیوں کو سرد ہوا

۱۔ گو دھول - چراگاہوں سے پلٹے ہوئے سریشی کی چالوں سے اڑتی ہوئی گرد۔

"The winds seem to come

from garden of Sleep.

۲۔ winds worth



یہ شاخسار کے جھولوں میں پینگ پڑتے ہوئے  
یہ تال سم، یہ چھپا چھپ - کہ کان بجتے ہیں  
نشے میں چورسی پر چھائیاں تھرتھرتی ہوئی  
خوش سوز دردوں سے سلگ رہی ہے یہ شام

یہ نظم برسوں کی خاموش کاوش کا نتیجہ ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں مجھے "مادی ٹھوس پن" کی کمی لگتی رہی ہے۔ میرے ہندو سنسکارت کا یہ تقاضا رہا ہے کہ جس طرح فن تعمیر میں اور زندگی کے صد ہا جزویات میں مادی وزن اور ٹھوس پن یا بھرپور پن کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور لسانی احساس کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے اسی طرح اردو شاعری کو بھی اس دولت سے مالا مال ہونا چاہئے۔ یعنی شاعری کو بت گری کا حریف بنانا چاہئے، یہ خصوصیت صرف ہندو کچھر کی نہیں رہی ہے بلکہ تمام آریہ تہذیب کی خصوصیت رہی ہے جس میں قدیم ایرانی تہذیب بھی شامل ہے اسی تو فردوسی کے شاہنامے میں وہ ٹھوس اور بھرپور مصوری یا بت گری ہمیں اکثر مل جاتی ہے جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ کہیں کہیں میرا تیس بھی فردوسی کے فیضان سے مستفید ہو کر مادیت کا جادو دکھا گئے ہیں۔ یہ صفت سب نمایاں شکل اختیار کرتی ہے۔ مناظر فطرت کی مصوری میں جس سے انگریزی ادب محروم ہے۔ فطرت بڑی ٹھوس اور بھرپور چیز ہے۔ دوسری کمی فارسی اور اردو شاعری میں عموماً یہ رہی ہے کہ فطرت کی مصوری میں چابک دستی سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور محویت یا ٹھہراؤ سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ ہماری نچر یہ شاعری کو مادے میں ڈوبنا نہیں آیا۔ ہمیں اپنے شعور کو فطرت کے وجود میں تحلیل کرنا نہیں آیا اس کا فیصلہ دوسروں پر ہے کہ جو اقتباسات اب تک پیش کئے گئے ہیں ان میں مادیت اور مادیت میں محویت کے عناصر پیدا کرنے میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

اب میں مضمون کے خاتمے پر پہنچ گیا ہوں۔ ایک انگریزی شاعر نے بچپن کا بیان ان مصرعوں میں کیا ہے۔

"To see a world in a grain of sand A Heaven in a wild flower.  
To hold divinity in the palm of your hand And eternity in  
an hour."

جن کے زیر اثر مندرجہ ذیل حصہ "جگنو" نامی نظم کا مرتب ہوا۔

میں کیا بتاؤں وہ کتنی حسین دنیا تھی  
سمجھ سکے کوئی اے کاش عہد طفلی کو  
ہوا والا خود رو میں دیکھنا جنت  
اٹھا کے رکھ لے خدائی کو جو ہتھیلی پر

سنا۔ ! وہ قادرِ مطلق ہے ایک ننھی سی جان خدا بھی سجدے میں جھک جائے سارے جس کے

میں اپنی نظم "تلاش حیات" کے آغاز میں جس بحر اور لب لہجہ اور جن صوتیات کو کام میں لایا ہوں وہ سراسر انگریزی شاعری کی دین ہیں۔ وہی ٹھہراؤ، وہی سنجیدگی اور وہی سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھنے والی آغاز جو لہجہ ادقات انگریزی شاعری میں ہمیں مل جاتی ہے۔ البتہ آگے چل کر یہ ٹھہراؤ ایک چڑھتے سردی کا نایا مصود (cease and) کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ میری نظم "دھرتی کی کر دھ" میں وہی خیالات و تصویریں پیش کی گئی ہیں جو انگریزی ادب سے ہی حاصل ہو سکتی تھیں اور جن میں دالہانہ اور جدانی انداز بیان دیکر زندہ جاوید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "جنت دلا" بھی میری وہ نظم ہے جو صرف فارسی یا اردو جاننے والوں سے بڑا شاعر نہیں لکھ سکتا تھا اور جس کے اہم ترین حصے پر انگریزی شاعر وہ ڈر ورتھ کے اثرات خوراً پہچان لئے جائیں گے۔ آخر میں "داستانِ آدم" نامی اپنی نظم کا ذکر کروں گا جس میں آغاز آفرینش سے آج تک کی تہذیب تمدن کے مناظر، کوائف و مسائل ایک ڈرامائی انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔



# تاریخ اٹلی کا ایک انتہائی حیرتناک واقعہ

## نیا فتح پوری

دنیا میں رسوم و عواید اور اتفاقات و حوادث کے عجیب و غریب واقعات سننے میں آتے ہیں مثلاً یہ کہ اسپین کا ایک مہتمل تاجر آئرلینڈ کا ایک حسین و شیرازہ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور جب وہ جہاز پر سوار ہو کر اسپین جانا چاہتی ہے تو بحری قزاق اسے گرفتار کر کے مراکش لے جاتے ہیں وہاں کا فرمانروا سلطان محمد اسے دیکھ کر فریفتہ ہو جاتا ہے اور وہ کامل ۳۰ سال تک مراکش پر حکومت کرتی ہے۔ یا یہ کہ آئرستان کا ایک شخص آئرلینڈ کے ہاتھ پائیوں کا پیدا ہوتا ہے لیکن محض اپنے عزم و ارادہ سے ان فطری نقائص کا مقابلہ کر کے ایک بڑا آدمی بن جاتا ہے اور چودہ سال تک برطانوی پارلیمان کا ممبر رہتا ہے۔ یا یہ کہ ایک ہندو سادھو اپنا ہاتھ بلند کر کے بارہ سال تک اسے نیچے نہیں لاتا اور وہ خشک ہو کر رہ جاتا ہے یہاں تک کہ چڑیاں اس پر گھونسلا بنانے لگتی ہیں۔ لیکن وہ خاص واقعہ جس کا ذکر میں اس وقت کرنا چاہتا ہوں اتنا عجیب و غریب ہے کہ عقل انسانی اس کے باور کرتے سے عاجز رہتا ہے۔

برطانیہ اپنی زیادہ زمانہ نہیں گزرا اب صرف ۶۰ سال قبل کی بات ہے کہ اٹلی کا فرمانروا اومبرٹو اول ۲۸ جولائی ۱۹۰۰ء کو قصبہ مونزا پر ایک ہوٹل میں داخل ہوتا ہے اور کھانا طلب کرتا ہے۔ ایک فرجی جنرل بھی اس کے ساتھ ہے۔ دورانِ طعام میں اس کی نگاہ دفعتاً ہوٹل کے مالک پر پڑتی ہے اور صورت و شکل و وضع و قطع میں وہ اسے بالکل اپنا مماثل پا کر حیران رہ جاتا ہے، کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ جنرل سے کہتا ہے کہ میں نے اس شخص پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، لیکن یاد نہیں آتا کہ کہاں اور کب۔ اسے بتاؤ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ:- ”میں نے اس سے پہلے تم کو کہیں دیکھا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہاں؟“  
 — (مُسکرا کر) آپ نے مجھے اپنے ہی آئینہ میں دیکھا ہوگا، کیونکہ میرے بابت مشورے کہ میں بالکل آپ کا ہم شکل ہوں۔  
 بادشاہ:- یقیناً تم میرے ہم شکل ہو اور تمہاری وضع و قطع بھی بالکل وہی ہے جو میری۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟  
 — ”حضور مجھے اومبرٹو کہتے ہیں۔“

بادشاہ (حیرت سے): ”اومبرٹو!۔ یعنی تمہارا نام بھی وہی ہے جو میرا ہے؟ تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟“  
 — ”ٹارنیو میں۔“

بادشاہ: کیا کہا؟۔ ٹارنیو!۔ یہیں تو میں بھی پیدا ہوا تھا۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟  
 ”جی ہاں ۲۲ اپریل ۱۸۷۷ء کو میری شادی ہوئی اور میری بیوی کا نام مارگریٹا ہے۔“

بادشاہ یہ سن کر حیران رہ گیا کیونکہ اس کی شادی بھی اسی تاریخ میں ہوئی تھی اور اس کی بیوی کا نام بھی مارگریٹا تھا۔ پوچھتے ہوئے



کوئی اولاد بھی ہے۔ اس نے کہا "ہاں ایک لڑکا ہے جس کا نام میں نے دتو رپو رکھا تھا۔"

یہ سن کر بادشاہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ اس کے ولی عہد کا نام بھی یہی تھا پوچھا "یہ کاروبار تم نے کب شروع کیا۔" اس نے کہا "جنوری ۱۰۰۰ء کو" اور یہی تاریخ بادشاہ کی تخت نشینی کی بھی تھی۔

بادشاہ نے پوچھا "کیا میں تم کو اس سے پہلے کبھی دیکھ چکا ہوں؟"

"مجھے دوبار آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، ایک بار جب میں معمولی سپاہی تھا اور دوسری بار جب میں سارجنٹ ہو گیا تھا۔ آپ اس وقت کرنل تھے اور فوج کے کمانڈر تھے۔"

بادشاہ یہ سب سن رہا تھا اور حیران تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ہوٹل کے مالک نے عرض کیا کہ "اب میں رخصت چاہتا ہوں اور متوقع ہوں کہ حضور آئندہ بھی جب کبھی یہاں تشریف لائیں گے تو اس خادم کو فراموش نہ کریں گے" وہ یہ کہہ کر جانا ہی چاہتا تھا کہ بادشاہ نے پوچھا "تمہیں ورزشی کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے یا نہیں۔ تم کو معلوم ہوگا کہ میں اسی تقریب کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں اور مجھے خوشی ہوگی اگر کل کھیل کے میدان میں تم مجھ سے مل سکو۔"

"میں ضرور حاضر ہوں گا۔"

اس کے جانے کے بعد بادشاہ نے اپنے جنرل سے کہا کہ "تم نے دیکھا کہ یہ شخص مجھ سے کتنا مائل ہے۔ میں اس کو ولی عہد کا اتالیق بنانا چاہتا ہوں۔ کل جب یہ کھیل کے میدان میں آئے تو یاد کر کے اسے میرے پاس لاؤ، مجھے اس سے بڑی محبت ہو گئی ہے۔"

ورزشی کرتب جاری ہیں۔ سارا مجمع ان کے دیکھنے میں محو ہے کہ بادشاہ کو پچھلے دن کے سارے واقعات پھر یاد آ جاتے ہیں اور اس کی نگاہیں اپنے ہمزاد کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ لیکن جب وہ کہیں نظر نہیں آیا تو بادشاہ جنرل سے دریافت کرتا ہے کہ "میرا دوست کہاں ہے۔ وہ اب تک کیوں نہیں آیا۔ اس نے تو مجھ سے حتمی وعدہ کیا تھا کہ وہ یہاں آئے گا" اور مجھ سے ملے گا۔

جنرل نے نہایت تاسف آمیز لہجہ میں کہا کہ "بیشک وہ یہاں نہیں آیا اور نہ آ سکے گا، کیونکہ آج ہی صبح وہ بدوق کے ایک حادثہ سے ہلاک ہو گیا ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ کسی نے گولی سے اسے ہلاک کر دیا۔"

یہ سن کر بادشاہ پر سکتہ طاری ہو گیا اور ہنوز اس کی حیرانی دور نہ ہوئی تھی کہ دفعتاً بدوق کے دو فرہم ہوئے اور دونوں گولیاں بادشاہ کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔!

## نظمیں

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی وار دو کلام میں عارفانہ رنگ، اس کی قدرت بیاق و زبان، اس کا معیاری لغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی و سانی درجہ، اس کے دنیا زات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، معاصرین کی رائیں، مستند ادباء کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل ہنر ہے۔ قیمت تین روپے۔

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ، کراچی نمبر ۳



# سودا کے قصائد و بحریات

ابجلیل نخعی جلالپوری

اردو قصیدہ کی تاریخ میں سب سے پہلے جس شاعر کے یہاں قصیدہ کی باضابطہ طور پر ابتداء نظر آتی ہے وہ دلی دکنی ہے۔ قصائد اردو کے مصنف سید جلال الدین احمد جعفری کے بیان کے مطابق ”دلی نے صرف پانچ قصیدے کہے ہیں۔ اور وہ بھی کے سب حمد و نعت یا منقبت و موعظت کے مضامین سے لبریز ہیں اور ان قصیدوں کی حیثیت ہر لحاظ سے بالکل ابتدائی ہے۔ اردو میں اس صنف سخن کی ابتداء کا سہرا دلی کے سر ہے۔ اس کی تقلید شعراء عہد مابعد نے بھی کی لیکن سودا نے اسے انتہائے پختہ بنا دیا۔

قصیدہ کی خاص زبان ہوتی ہے اور تراکیب کی حسی الفاظ کی شوکت، استعارے اور تشبیہات کی ندرت، اسلوب کا طہر و بان کی جان ہیں۔ اور سودا کے قصائد ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں۔ انھوں نے اردو قصیدہ کو دوام بخشا۔ اس کے مضامین محبت پیدا کی اور فنی لحاظ سے اسے چار چاند لگائے۔ ان کے کلام کی شہرہ، ان کے طرز بیان کی رنگینی۔ بندشوں کی حسی اور کی نشست، خیالات کی بلندی، استعاروں اور تشبیہوں کی ندرت و خصوصیات ہیں سودا کی قصیدہ نگاری کی جس کا اعتراف نے کیا ہے۔

اردو قصیدہ میں سودا کی عظمت کے بارے میں بہت لکھا جا چکا ہے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

طبقات الشعراء

اگر ان کے قصائد عرفی اور خاقانی سے سبقت لے گئے ہیں تو ان کی غزلیں ابوطالب، کلیم، اور سلیم کو پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ مصحفی

”ان کی غزلیں آبدار اور قصیدے سحر کار ہیں۔“

نواب مصطفیٰ خاں شیفۃ

”فقیر کے خیال میں ان کی غزلیں قصیدے سے بہتر ہیں اور قصیدے غزل سے بہتر ہیں“

مرزا قتیل

”سودا کا مرتبہ قصائد میں ظہوری کے برابر ہے۔ سوائے اس کے کہ دونوں کا طرز الگ الگ ہے اور کوئی فرق نہیں“

آزاد

مرزا قتیل جو چاہیں کہیں مجھے کمال نے ظہوری کی غزلیں اور تھوڑے بہت قصیدے پڑھے ہیں دونوں استعاروں اور تشبیہوں



کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا کی مشابہت تو انوری سے ہے جو قصائد اور ہجو نیز محاورے اور ن  
دونوں کے بند شاہ ہیں۔

سودا نے ہر رنگ کے قصیدے لکھے اور ہر رنگ میں اپنی استاد کا کمال دکھایا۔ لیکن ان کے زمانے میں جس نوع کی مانگ تھی  
شہر آشوب اور ہجو یہ قصیدہ تھا۔

سودا کی عظمت و شہرت کا سبب ان کے مدحیہ قصیدے نہیں۔ انھوں نے مدحیہ قصیدے زیادہ نہیں لکھے۔ اور جو لکھے بھی  
رنگ ہجو یہ قصیدوں اور شہر آشوب کے مقابلہ میں پھیکا ہے کیونکہ مغلیہ سلطنت اور بالخصوص نوابان اور دھوکے ادا بار کے بعد قصیدہ  
کا کوئی محرک باقی نہ رہا تھا وہ مدح بھی کرتے تو کس کی کرتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جنب و نوب نے چار روپیہ ماہوار کی نوکری اختیار کی جو ہزار خرابی آخر عمر میں سو روپیہ ماہوار تک پہنچی۔  
کی بھی معاشی حالت ایسی تھی۔ انھوں نے وہلی کو خیر باد کہہ کر پہلے فرخ آباد میں کچھ عرصہ کے لئے مہربان خاں رنر کے دامن میں  
لی اور پھر فیض آباد میر آصف الدولہ کے سایہ عاطفت میں۔ لیکن بے اطمینانی نے کہیں ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی لئے ان کے  
قصائد کا بھی ایک خاص رنگ ہے جس میں مدح کی مدح سے زیادہ ضنائی حقیقی کو سامنے رکھا گیا ہے اور گریز بھی خاص  
رکھتی ہے۔

مثلاً آصف جاہ کی تعریف میں جو قصیدہ سودا نے لکھا ہے اس میں خوشی ایک نازنین کا روپ دھار کر شاعر کو ترغ  
عیش و نشاط دلاتی ہے۔ جب سودا اس ترغیب کی وجہ پوچھتا ہے تو وہ بیان کرتی ہے کہ آصف جاہ کی سالگرہ ہے اس  
کی تشبیب میں خوشی، جس ہوش رہا نازنین کا قصہ کا روپ دھارتی ہے۔ وہ بے تکلف موسیقی کی اصطلاحوں میں باتیں کر  
اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ سودا محض خوشی کی تصویر نہیں کھینچ رہا ہے بلکہ خوشی کے اس خاص تصور کی تصویر کھینچ رہا ہے جو  
کے رہنے والوں کو مرغوب ہے۔

یہی حال سودا کی تشبیب کا ہے۔ تشبیب میں چونکہ جذبہ کم دبیش سرے سے مفقود ہوتا ہے اس لئے اس کی  
اور ایچ لیتی ہے جسے طباعی کہتے ہیں۔ اور ذیل کے چند مطلعوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودا کس قدر طباع تھا۔

بسان دانہ ردیدہ ایک بار گرہ

اٹھ گیا بہمن دے کا چمنستان سے عمل

میں نے دُرخن کو دیا سنگ رنگ دھنگ

تہا دندہ اس رقم میں کب اس رنگ رنگ دھنگ

تاہم جیسا کہ گزشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے سودا کی ابدی عظمت اور دائمی شہرت کا سبب ان کے مدحیہ قصیدے نہیں بلکہ  
ہجو یہ قصیدے اور شہر آشوب ہیں۔ سودا کے ان قصیدوں میں موضوع اور فن آپس میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ دونوں  
قسم کا خط متاثر کہ کھینچنا دشوار ہے۔ سودا ان قصیدوں میں اس قدر جذباتی نظر آتے ہیں کہ فنی قدروں کو نظر انداز کر دیں اور نہ محض  
اپنے ادب پر اس قدر تسلط کرتے ہیں کہ موضوع کی اہمیت کو بالکل ہی فراموش کر جائیں۔

ان کے قصیدوں میں سراسر آم ہے۔ ہر طرف سے جذبات کے بادلی اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اگر جذبات کی شدت کی وجہ







غرض میں کیا کہوں اب یارو دیکھ کر یہ قبر  
کرد مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یہ لہر  
جو تک بھی امن دل اپنے کو یوں لیے گردش ہر  
تو بیٹھ کہ کہیں روئے کہ مردم شہر  
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

اس کے ساتھ اگر آپ سودا کے باقی دو شہر آشوب بھی ملا کر پڑھیں تو دہلی کی تباہی و بربادی، سودا کے دقت کی اد  
بد حالی اور مغلیہ سلطنت کے زوال کی پوری تصویر سامنے آجائے گی۔ اس بنا پر سودا کے متعلق ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ جس طرح روم  
کے زوال کی تصویریں دیکھنا چاہیں تو ہم جو دانیال جیسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں اسی طرح ہم اگر زوال دولت مغل  
سچی تصویریں دیکھنا چاہیں تو ہم کو چاہئے کہ سودا کی ان پر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں جن میں انھوں نے مرہٹہ سواروں کی  
دہلی کی دیواروں کے نیچے قبلہ و غارت گری کا سچا فوٹو اتارا ہے یا جس میں زمانہ کی پر آشوب حالت اور امرائے دہلی کی تباہی و بربادی  
کا بیان نہایت پر زور اور دردناک طریقے سے کیا ہے۔

ان کی دوسری نظموں "تضحیک روزگار" اور "قصیدہ شہر آشوب" کا مضمون بھی بہ ادنیٰ تغیر یہی ہے جو محسن  
کا ہے۔ اس دقت کے معاشرہ کو بدلنا سودا کے بس میں نہ تھا۔ لیکن اسوقت صحیح ذہنیت کا خاکہ پیش کرنا ضرور ان کے  
میں تھا جسے انھوں نے پورا کیا۔

### ہجویات اور سودا کا فن

شہر آشوب کے بعد سودا کا دوسرا مخصوص میدان ہجویہ قصائد ہیں۔ شہر آشوب کی طرح ہجویہ قصائد کو بھی سودا  
زمانے کے خاص حالات نے پیدا کیا۔ سودا کے زمانے میں جو بیشتر تمدنی اور جہشی ناہمیاریاں پیدا ہو چکی تھیں اور  
افراد مختلف قسم کی اخلاقی کمزوریوں کے شکار ہو چکے تھے ان سب سے سودا کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اس متاثر  
روئے عمل اختیار کیا وہ ہجویہ قصائد کی صورت میں رونما ہوا۔ اور ان تمام کمزوریوں کو خواہ وہ مجموعی طور پر تمام  
جاتی تھیں یا مختلف افراد میں شخصی طور پر موجود تھیں۔ ان سب کو اپنے طنز و تعریض کے تشبہوں کا ہدف بنایا۔

اس حقیقت کے پیش نظر جب ہم سودا کی ہجویات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی دو قسمیں نظر آتی ہیں۔ پہلی قسم تو ان ہجویات کی ہے جن میں محض اجتماع  
پر تنقید کی گئی ہے۔ مثلاً ہجو شیدی فولاد خاں کو تو ان جہاں آباد "دوسری قسم ان ہجویات کی ہے جن میں مخصوص افراد کو  
نشانہ بنایا گیا ہے۔ ایسی ہجویات کی مثالیں یہ ہیں۔ مثلاً "شخص متعصب" امیر دولت مند بخیل، طفل لکڑی باز،  
رفیق، شخص کشمیری وغیرہ وغیرہ۔ لیکن صاحب قلم حضرات کا ایک گروہ ایسا ہے جو سودا کی مؤخر الذکر ہجویات کو اعتراض  
نظر سے دیکھتا ہے۔ ان حضرات میں مولانا آزاد، سید عبدالرحمن اور مولوی عبدالسلام سے لے کر مولانا آسی اور شیخ چاند سیم  
شامل ہیں "قریب قریب ان سب نے سودا کی ان ہجویات کو بے شرمی کا مجموعہ کہا ہے۔ مگر ہجویات سے پردہ داری اور شر  
کی امید فضول ہے۔ اگر ہجو کہنی ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں تو اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ حریف کی مٹی خراب کی جائے  
میں طنز، فقرے، پکھتی، کدانیہ حتیٰ کہ فحش کلمات سے بھی کام لینا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہجو دود باری تلوار  
کند ہونی یا داراد چھا پڑا تو حریف بچ جائے گا اور ہجو گو خود زد ہیں آجائے گا۔ اس لئے ہجو کا تقاضا یہی ہے کہ جب  
کھولی جائے تو پھر رعایت بخشی کیسی، جو کہہ دو ٹھیک ہے..... مقصد ایسا حاصل ہونا چاہئے کہ حریف منہ دکھا  
قابل نہ رہے بلکہ



مختار صدیقی کے اس بیان کے پیش نظر ہم مزید یہ بھی کہیں گے کہ موضوع یا فن کے لحاظ سے آج ہماری نظریں انکی ہمت ہو یا نہ ہو لیکن سودا نے اس قسم کی ہجویات لکھ کر اس وقت کے معاشرہ کے عام رجحانات و میلانات کو کسی نہ کسی طرح ضرور کر دیا ہے۔ جب معاشرہ ناقابل علاج حد تک بگڑ جاتا ہے تو افراد ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے اور ایک دوسرے پر چھانٹنے کو اپنا بہترین مشغلہ سمجھنے لگتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سودا نے اپنی ان طنزیہ اور ہجویہ نظموں میں اپنے حریفوں کو کچھ ہی کچھ کیا جو کچھ سرشار نے اپنے کرداروں کے ساتھ فسانہ آزاد میں کیا۔ ہمیں اس بے لحاظی اور بے شرمی کے بے نقط مجموعہ کی سرانکھوں پر رکھنا چاہئے۔ اس بنا پر نہیں کہ یہ کوئی بلند اخلاقی نمونہ ہیں بلکہ اس لئے کہ اگر آج ہم تک یہ بے لفظ مجموعہ ”چھ تو ہمیں اس وقت کے بعض اشخاص کی انفرادی اخلاقی کمزوریوں کا کیسے اندازہ ہوتا۔ ان کے بغیر ہمیں کیسے پتہ چلتا کہ سودا تارنے کا معاشرہ اتنا گر چکا تھا۔ تاہم سودا نے یہ نظمیں لکھ کر کوئی تعمیری کارنامہ انجام نہیں دیا بلکہ بعض اکابر صحابہ کی ہجو کر کے انے خود اپنے مذہب تشیع کو بھی بدنام کیا۔

اب ہم ان نظموں کو لیتے ہیں جن کی نمائندہ نظم ”ہجو شیدی فولاد خاں کو تو اں جہاں آباد“ ہے۔ یہ نظم خاصی طویل ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فولاد خاں بظاہر تو جہاں آباد کا کوتوال ہے اور اس بنا پر ہر قسم کی بد نظمی کو روکنے کا ذمہ دار ہے۔ لیکن کت یہ ہے کہ تمام چور، ڈاکو اور قاتل اس کے ہر معاملہ میں رازدار ہیں، وہ ان کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ سودا کی یہ نظم دراصل تنقید ہے اس وقت کے اکابر کے اخلاقی زوال پر جس میں سودا نے تمام جزئیات کو اس قدر تفصیل سے بیان کیا ہے کہ اس میں مزید اضافہ کرنا مشکل ہے۔

## سالنامہ تذکروں کا تذکرہ نمبر ۱۹۶۳ء

جس نے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کیا ہے کہ

- ★ تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے ؟
- ★ اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں ؟
- ★ تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا ؟
- ★ اردو، فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ؟
- ★ ان تذکروں اور ان کے مصنفین کی کیا نوعیت ہے ؟
- ★ ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے ؟
- ★ ان سے کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے ؟
- ★ ان تذکروں میں اردو، فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے ؟
- ★ یہ خزانہ ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے ؟

قیمت :- چار روپے

صفحات :- ۳۵۲ صفحات

نگار پاکستان - ۳۳ گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳



# لکھنؤ مرحوم

نیشا فیتھ پوری

ترے خیال سے روح اہتراز کرتی ہے  
یہ جلوہ ریزی بادوبہ پر فشانی شمع

لکھنؤ یوں تو ایک وسیع شہر ہے میلوں لمبا چوڑا، لیکن اصلی حقیقی لکھنؤ نام نیا صرف اس تین چار فلاں گنگ کی تنگ تاریک "سرک کا چوکری دروازہ سے شروع ہو کر گول دروازہ پر ختم ہوجاتی ہے اور چوک کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اس سے مراد موجودہ چوک نہیں بلکہ وہ جسے میں ۶۵ سال پہلے دیکھا تھا اور جس کی جھلک کسی نہ کسی حد تک اس وقت بھی پائی جاتی تھی جب میں تیسری بار شہر میں مستقل قیام کے ارادہ سے یہاں آیا۔ شہر کے بعد تو خیر، چوک کیا سارا لکھنؤ ہی ختم ہو گیا اور وہاں کی وضع دریاں اور طرعیاریاں سب خواب و خیال ہو گئیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اصلی لکھنؤ یعنی عہد شاہی کا لکھنؤ تو وہ تھا جسے رجب علی بیگ سرور نے دیکھا تھا، لیکن اب سے تقریباً پون صدی پہلے جب میں اول اول یہاں آتا تو اس وقت بھی "دیوان گلستاں پر کچھ کچھ دھوپ باقی تھی" اور اب کیا عرض کروں کہ یہ جاتی ہوئی دھوپ بھی کیا چیز تھی؟

چوک کی یہ سرک دراصل شہرگ تھی لکھنؤ کی جس میں خون کی جگہ — "شاہد و شمع و شراب شکر و نائے دسرود" جاری و ساری تھی۔ ساری دنیا میں آفتاب جب پائے طلوع ہو۔ لیکن یہاں وہ طلوع ہوتا تھا شام ہی کو اور جب صبح ہوتے ہوتے وہ غروب ہوتا تھا تو خدا جانے حسن و محبت کی کتنی داستانیں اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

جھٹ پٹا ہوتے ہی وہ "پروگیاں حریم ناز" کا اہتمام دلربائی — وہ "حوریاں بزم سوز و ساز" کی جلوہ فرمائی — وہ فردوس گوشت و نمہائے جامگداز — وہ جنت نگاہ عشوہ ہائے دلنواز — وہ فضاے مشکبو — وہ صدائے ہائے دہو — گویا ایک سیلاب بھارنگ نور کا ایک تلاطم تھا شاہد و سرور کا یا بقول غالب سے عرش سے تافرش اک طوفان تھا موج رنگ کا۔

غیر باتیں تو وہ ہیں کہ سے

آسودہ شبے بایر و خوش ہمتا بے تابا توہ کایت کمن از ہر بابے

اب نہ آپ کو فرصت سننے کی، نہ مجھ میں تاب سننے کی۔ مختصر آیوں سمجھ لیجئے کہ یہ تھا وہ لکھنؤ اور یہ تھی اس کی فضاے رنگ۔ وہاں میری شہاب کا پہلا چاند طلوع ہوا اور جس کی خاک تابناکیوں میں، معلوم نہیں میری زندگی کے کتنے تاریک گوشے روشن ہوئے۔

میری حیات کے تین طویل وقفے یہیں بسر ہوئے، ایک آغاز عہد شعور کا، دوسرا غنفہ الہامی شباب کا اور تیسرا چنگی عمر کا۔ سو پہلے ووز مالو کو تو چھوڑتے کہ ان کی داستان بڑی طویل ہے۔ چند باتیں آخری عہد کی سن لیجئے، خواہ وہ ہفوات ہی کیوں نہ ہوں۔



چوک تو خیر اب بھی وہیں تھا جہاں پہلے پایا جاتا تھا، لیکن اس کے ذرہ ذرہ سے اہل پڑنے والا کیف و سرور بہت ماند پڑ گیا تھا اور چودھرائی کا اجر پڑنے کے بعد جو ایک بڑا ادارہ تھا لکھنوی تہذیب و ثقافت کا، ایک اہم مرکز تھا مجالس شعر و سخن کا، کم از کم میری دلچسپیوں کا سوال تو باقی ہی نہ رہا تھا۔ ہم دیرینہ صحبتوں کی یاد میں شام کو ”خواجہ عبدالرؤف عشرت“ کی دوکان پر کچھ دیر بیٹھنا ضروری تھا، کیونکہ ان کی دوکان چودھرائی کے مکان کے بالکل منہ ہی واقع تھی (جہاں اب حنا بلڈنگ بن گئی ہے) اور ہمیشہ اسباب ذوق کی نشست گاہ رہ چکی ہے۔ ایک بوسیدہ دری کافرش، سامنے سڑک کنارے ایک ٹوٹی بیچ، دو تین شکستہ الماریاں اور زمین پر کتابوں کا ڈھیر۔ یہ تھی وہ دوکان جہاں خواجہ صاحب ۴ بجے شام سے رات کے گیارہ بجے دو زانو بیٹھے رہتے اور لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ یہی دوکان مولانا شریک کا اڈا تھا، اسی جگہ مولانا شبلی نعمانی بھی آکر دم لیتے تھے اور یہی جگہ تھی جہاں سے حضرت ریاض خیر آبادی مرحوم ایک بار تفنناً فقیروں کے بھیس میں بھیک مانگنے باہر نکلے اور جب وہ چوک کا چکر لگا کر لوٹے تو اپنی دلی کی دولت سے سارے احباب کی دعوت کر دی۔

اس دوکان کی کشش کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ ناف چوک میں واقع تھی اور چودھرائی کا مکان سامنے ہو۔ نہ کی وجہ سے غنائے فائدہ بایہ سے لطف اندوز ہونے کا بھی موقع لوگوں کو مل جاتا تھا جس سے شر و شبلی بھی مستثنیٰ نہ تھے۔

ایک شام جب حسب معمول چوک آنے کے لئے یاہر نکلا تو طبیعت بہت افسردہ تھی، لیکن جانا ضرور تھا۔ امین آباد کے چوراہہ پر پہنچے درجب تنہا سپوینچ کر آگے بڑھا تو اکبری دروازہ کے منکر پر دفعتاً ایک میر صاحب نظر آئے۔ قدیم لکھنوی وضع کے مگر شکستہ حال اور ضرورت زیادہ نڈھال ایک پتلی سی چھڑی پر ٹوپی کے کڑھے ہوئے پتلے لٹکائے ہوئے فروخت کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں رُک گیا۔ اور کچھ دیر خاموش آن کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ان کی باتیں سننے کے لئے ایک پتہ ہاتھ میں لیا اور اس کی قیمت پوچھی۔ ”تیچی اور مری کے کام کا ہاتھ نہ تھا۔“ یہ تو بھلا، نے اس کی تمام تر خوبیوں پر ایک طویل تقریر کی، پھر فرمایا ”آپ نے پار والے محمد علی خاں کا نام تو سنا ہی ہوگا۔“ کے کاڑھے ہوئے ہر مال پر ملکہ و کٹوریہ نے تمغہ دیا تھا۔ یہ پتہ انہیں کی نو اسی نے کاڑھا ہے اور میں نے بڑی دشواری سے حاصل کیا ہے۔ مگر واشد تو آپ کی دیدہ دری کا قائل ہو گیا۔ سبحان اشکر کیا بچان ہے۔ کیا نگاہ ہے۔ آپ کو پسند ہے تو لے لیجئے۔ قیمت کی فکر نہ کیجئے تحفہء حاضر ہے۔ میں نے شکریہ ادا اور پوچھا کہ ”حضرت یہ تو تانا سہی پڑے گا کہ اس کا ہدیہ کیا ہے؟“ فرمایا ”یہ ہے تو بہت قیمتی، لیکن شام ہوگئی ہے اور مجھ صاحب کی سوڑ خوانی میں ی شرکت ضروری ہے“ اس لئے آپ دس روپے دیے، آپ کو قدردان سمجھ کر میں نے قیمت بہت کم کر دی ہے، ورنہ نواب باقر علی خاں کے دلدوز نے اس کے بیس روپے لگا دیے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔

یہ سن کر میں دل ہی دل میں ہنسا کیونکہ میری نگاہ میں اس کی قیمت کسی طرح دو روپیہ سے زیادہ نہ تھی۔ میں نے دبی زبان سے بھکچاتے ہوئے کہا۔ ”موس ہے میں اس نعمت سے محروم رہوں گا۔ کیونکہ اس وقت میرے پاس صرف دو روپے موجود ہیں۔“ اور یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چلا تھا کہ ت سے آواز آئی۔ ”اے حضرت! ادھر تو تشریف لائیے، اگر آپ دس روپیہ نہیں دے سکتے تو کوئی مضائقہ نہیں یا روں کی چھوٹ بھی دیکھتے جائیے“

”دو روپے ہی سہی۔“

البعین محرم کا زمانہ ہے اور چوک سے منبرج مبارک کا جلوس نکل رہا ہے میں بھی دوکان کے ایک تنخے پر کھڑا ہوا جلوس کا انتظار کر رہا ہوں کہ کہاں سامنے کے کوٹھے کا پردہ جنبش میں آتا ہے۔ اور ایک نہایت حسین چہرہ اس کے اندر سے جھلکنے لگتا ہے۔ اس کے بعد ہی پردہ بالکل ہٹ جاتا اور ایک حسن بے عیاں سامنے آکر مصروف تماشہ ہو جاتا ہے، اوروں کے ساتھ میں بھی ٹٹکی لگا کر ادھر دیکھنے لگتا ہوں کہ ٹٹیک۔ اسی وقت ایک برقعہ تصعیف فاتون ہاتھ میں تسبیح لئے میرے پاس سے گزرتی ہے۔ اور میری محبت کو دیکھ کر کہتی ہے۔ کہ ”میاں آج کے دن تو اوپر نہ دیکھو۔“ منبرج



مبارک کا احترام کرو۔ میں سن کر بولا کہ ”بڑی بی ان سے بھی تو کہو کہ آج کے دن نیچے نہ دیکھیں۔“  
 اس کے بعد بڑی بی چلی گئیں۔ ضریح مبارک کا جلوس بھی نکل گیا۔ وہ جلوۂ لب بام بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن فضا ہنسی  
 رہی تھی، دل بدستور بیتاب تھا اور غالب کا یہ شعر زبان پر ہے  
 چاہے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے  
 گھر پلٹ آنے پر بھی دیر تک یہ خیال دل میں چٹکیاں لیتا رہا۔ اور بالکل ایسا ہی ایک دوسرا صبر آرمادو واقعہ بھوپال کا سامنے آنے  
 نے مجھ سے یہ شعر کہلوایا تھا کہ ہے

گھڑی گھڑی نہ ادھر دیکھے کہ ذل پہ مجھے  
 ہے اختیار پر اٹنا بھی اختیار نہیں

## اردو نامہ (مسلحہ)

کاسو لھواں شملہ شائع ہو گیا جو بیش قیمت علمی و تحقیقی مضامین سے  
 مزین ہے

- |                      |                       |                                              |                    |
|----------------------|-----------------------|----------------------------------------------|--------------------|
| ۱۔ اردو کی آوازیں    | ڈاکٹر گیان چندر       | ۷۔ اشتقاقیات                                 | ڈاکٹر شوکت سبزواری |
| ۲۔ لفظ صوتی کی تحقیق | سید قدرت نقوی         | ۸۔ آریائی یا دراوڑی                          | عین الحق فرید کوٹی |
| ۳۔ احسن اشعار بیان   | سعادت مرزا            | ۹۔ آئینہ ادب (ادبی رسائل کے مضامین کا اشارہ) | آغا افتخار حسین    |
| ۴۔ مکتوبِ قالب       | نحسین سروری           | ۱۰۔ اردو لغت کی دسویں قسط                    |                    |
| ۵۔ گلبنِ اردو        | (اسمعیل میرٹھی مرحوم) |                                              |                    |
| ۶۔ کلامِ آزرہ        | مرتبہ خلیق انجم       |                                              |                    |

قیمت فی کاپی ایک روپیہ سالانہ چندہ چار روپے

قیمت اقساط لغت فی جز و صرف چار آنے

اردو نامہ ترقی اردو بورڈ۔ ۶۷۲۔ اردو منزل جمشید پور  
 کراچی نمبر ۱



# نوادیر غالب

ایک غیر مطبوعہ خط اور ایک قطعہ

شیر احمد فاروقی

غالب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہنوز دل کاوش کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب تک تلامذہ نے والوں کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ اسی سال کے شروع میں غالب کے بارہ غیر مطبوعہ خطوط میں نے دریافت نقوش کے سال نامہ (۱۹۶۳ء) میں چھپوائے۔ آج یہاں ان کے ایک فارسی خط اور ایک قطعہ تاریخ کا متر کرتا ہوں۔

## غالب اور سرسید

خط سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) کے نام لکھا گیا ہے۔ اس زمانے میں وہ "سرتو نہیں ہوئے تھے۔ لیکن آج تاجدار مغلیہ کے دربار سے انہیں جو ادالہ دولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ کا خطاب رحمت ہو چکا تھا۔ سرکار انگریزی کی میں منسلک ہونے کے بعد وہ مین پوری میں بہ حیثیت منصف مقرر ہوئے۔ وہاں سے ۱۸۴۲ء کو ان کا تہ فتح پور سیکری کے لئے ہوا۔ جہاں وہ چار برس تک منصف رہے۔ ۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو فتح پور سیکری سے دہلی تبدیل اس خط کے عنوان میں سرسید کے "منصف فتح پور ہونے کا ذکر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۴۲ء کے بعد لکھا گیا ہے اور سرسید کے برادر بزرگ سید محمد (مالک سید الاخبار دہلی) کا بھی حوالہ ہے جن کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہو طرح یہ زمانہ کتابت ۱۸۴۲-۱۸۴۶ء کے مابین قرار پاتا ہے۔

اس خط کی شان نزول بظاہر یہ ہے کہ سرسید احمد خان نے غالب کو غلام امام شہیدؒ کے دو نعتیہ اشعار بھیج کر تعزین کرنے کی فرمائش کی تھی۔ اس پر غالب نے محذوری ظاہر کی ہے۔ اس کے دو سبب ہیں: ایک تو یہ کہ وہ فرما چیزیں لکھنے سے طبعاً گھبراتے تھے۔ دوسرے یہ کہ غلام امام شہیدؒ اور ان کی شاعری کے بارے میں غالب کی رائے

۱۔ حالی: حیات جاوید۔ جلد اول/۱۱۱ (طبع اکادمی پنجاب لاہور)

۲۔ ماسبق/۱۱۳

۳۔ ایضاً/۱۱۳

۴۔ آباد کے باشندے تھے۔ ۵۵ سال کی عمر میں ۲ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو وہیں انتقال کیا۔ شہید کے کوئی اولاد نہیں تھی (نادر روز)



اچھی نہیں رہی۔ انہوں نے شہید کے اشعار کی تضمین کو اپنے لئے "دون مرتبت" سمجھا ہو گا۔ تیسرا سبب یہ بھی ہے کہ سرسید سے غالب کے تعلقات کبھی زیادہ مخلصانہ نہیں رہے۔ اسی خط کے لب و لہجہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب انہوں نے سرسید کی پہلی تصنیف آثار الصنادید کے لئے تقریظ لکھی (۱۸۴۷ء) تو اس میں نری نہ تھی۔ مصنف کتاب کی مدح میں بہت کم تھا۔ بعد ازاں سرسید نے آئین اکبری کی تصحیح کر کے چھپوایا (۱۸۵۶ء)۔ تو غالب سے اس پر بھی کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ غالب نے ۳۸ شعروں کی ایک مثنوی لکھ ڈالی۔ جو کلیات نظم فارسی میں موجود ہے۔ اسے سرسید نے کتاب میں شامل نہیں کیا بلکہ غالب کے پاس واپس کر دیا اور لکھا کہ اسی تقریظ مجھے درکار نہیں۔ کیونکہ اس میں غالب نے ابوالفضل اور آئین اکبری کے بارے میں اچھی رائے ظاہر نہیں کی تھی اور سرسید کو مشورہ دیا تھا کہ ان گڑے مردوں کو اکھاڑنے کی بجائے اہل فرنگ کی نئی ایجادیں ادبیات کی برکتیں ملاحظہ کریں تو معلوم ہو گا کہ آئین یہاں نبانی اسے کہتے ہیں اور آئین اکبری تقویم پارینہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ اشعار اس مثنوی کے ملاحظہ ہوں۔

نگ و عار بہت غالبے اوست  
آں شاید کش ریا آئیں بود  
درو فا اندازہ دان خود منم  
جائے آں دارد کہ جویم آفریں  
کس نداندا پنجم دامن در سخن  
چشم بکشد اندرین دیر کہن  
شیوہ و انداز اسپناں را نگر  
انچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند  
سعی بر پیشیناں پیشی گرفت  
کس نیارد ملک بہ زیں داشتن  
سند را صدگونہ آئیں بستہ اند  
ایں ہنرمنداں زخس چوں آوردند  
دود کشتی را ہی راند در آب  
گرد خاں گردوں بہ ہاموں می برد  
نرہ گا واسپ را ماند دماں  
باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ  
ترف چوں طائر بہ پرواز آوردند  
دزد و دم آرد حروف از صد گروہ  
می در خشد باد چوں اخگر ہمی

و نیکہ در تصحیح آئیں رائے اوست  
بچین کارے کہ اصلش ایں بود  
من کہ آئیں ریا در دشمنم  
گر بدیں کارش نگویم آفریں  
باید آئیناں نماخ در سخن  
گر نہ آئیں می رود باماسخن  
صاحبان انگلتاں را نگر  
تاچہ آئیں ہا پدید آوردہ اند  
زیں ہنرمند ہنر پیشی گرفت  
حق ایں قومست آئیں داشتن  
داد و دانش را بہم پیوستہ اند  
آتشے کس سنگ بروں آوردند  
تاچہ افسوں خواندہ اندانیاں بر آب  
گرد خاں کشتی بہ جیحوں می برد  
غلطک گردوں بگرداند خاں  
از د خاں و ورق ہرفتار آمدہ  
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آوردند  
ہیں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ  
می زنند آتش بیاد اندر ہمیں



شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ  
گشتہ آئین دگر تفویم یار  
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

رو بہ لندن کند ماں رخشده باغ  
پیش این آئیں کہ دارد روزگار  
مردہ پروردن مبارک کار نیست

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد رنجش پیدا ہو گئی۔ تا آنکہ جب جنوری ۱۸۶۶ء میں غالب رامپور گئے وہاں پسی میں مراد آباد کی ایک سرائے میں اترے۔ اس زمانے میں سید احمد خاں صدر الصدور تھے۔ انہوں نے جو ریا کے آنے کا حال سنا تو اصرار کر کے اپنے مکان پر لے گئے۔ مولانا حالی نے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

سر سید کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا، اس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خان مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے، ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی۔ مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے۔ میں نے سنا کہ مراد آباد میں سرائے میں بٹھڑے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہونچا اور مرزا صاحب کو۔ اسباب اور تمام راسیوں کے ساتھ اپنے مکان پر لے آیا۔ ظاہر ہے کہ سر سید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ راز لے کر اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے۔ اور دونوں کو جواب دامن گیر نہ ہو گیا تھا اور اسی لئے مرزا نے مراد آباد جانے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سید کے مکان پر پہونچے اور پانکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سر سید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھڑی میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سر سید نے کہا: آپ خاطر جمع رکھیے۔ میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا: بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے۔ انہوں نے کوٹھڑی میں لیجا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ: بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے، سچ بتاؤ کس نے پی ہے؟ شاید اسی لئے تم نے کوٹھڑی میں لا کر رکھی ہے۔ حافظ نے سچ کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر مخراب و منبری کنند

چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سر سید سنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی رفع ہو گئی۔ مرزا دو ایک

دن وہاں ٹھہر کر دہلی چلے آئے۔

حالی نے دو ایک دن بٹھڑے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن غالب پانچ دن تک سر سید کے جہان رہے تھے۔ تفتہ ہوا ایک خط میں لکھتے ہیں:

بوصاحب، کچھ نئی کھائی، دن پہلائے، کپڑے پھانٹے گھر کو آئے۔ ۸ جنوری ماہ و سال حال

دوشنبہ کے دن غضب الہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا، تمہارا خط مضامین دردناک سے

بھرا ہوا رامپور میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں

لکھا۔ عالی: حیات جاوید جلد اول / ۱۲۵ (حاشیہ)

۲۱۲۔ تہر: خطوط غالب / ۲۱۲



بہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انہوں نے بیمار داری اور غم  
خواری بہت کی۔

دوسرے خط میں سید احمد حسن مودودی کو لکھا ہے:  
”رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دازر و زبیتہ خوار ہوں۔ ریس حال نے مسند نشینی کا حشمت کیا۔ دعا گو  
دولت کو در دولت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتم اکتوبر کو دلی سے رام پور کو روانہ ہوا۔ بعد  
قطع منازل ستہ وہاں پہنچا بعد اختتام بزم عازم وطن ہوا۔ ہشتم جنوری کو دلی پہنچا۔ غرض راہ  
میں بیمار ہوا۔ پانچ دن مراد آباد میں صاحب فرانس رہا۔“

یہ ہے غالب اور سید کے تعلقات کی روداد جس کا ہمیں علم ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد  
بھی تعلقات کبھی رسمی تعلقات سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے ظاہر ادق اسباب ہیں۔ ایک تو سید سلسلۂ مذمت  
دلی سے باہر رہے۔ وہ شاعری تغن طبع سے زیادہ نہ کرتے تھے جو غالب سے خط و کتابت رکھتے۔ دوسرے  
یہ کہ خط و کتابت میں صلح صفائی ہوئی اور ان کے تین سال بعد غالب کا انتقال ہو گیا۔

## غالب اور غلام امام شہید

مولوی غلام احمد شہید سے غالب کیوں برا فروختہ تھے اس کا حال نہیں لکھتا۔ ایسا قیاس ہوتا ہے چونکہ وہ  
محمد حسن قتیل کے شاگرد تھے اور قتیل سے غالب کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ نیز شہید کے شاگردوں اور مداحوں  
حلقہ وسیع تھا اور وہ اپنے زمانے میں اچھے شاعر و نثر نگار شمار ہوتے تھے۔ حیدر آباد میں ان کی قدر افزائی  
ہوئی اور نواب محی الدولہ نے انہیں ایک ہزار روپیہ زاد راہ دے کر طلب کیا اور سرکارِ عالی سے چار سو روپے  
ماہوار مقرر کر دیئے۔ یہی نہیں بلکہ راجا گرو دھاری پرشاد اور محی الدولہ نے زاد و راہ دے کر انہیں سفر حج  
کے لئے روانہ کیا، اپنے مولود اور نعوتوں کی وجہ سے وہ عقیدت مندوں کا حلقہ بھی خاص رکھتے تھے۔ ان سب  
باتوں نے غالب پر ان کا مجموعی تاثر ایسا ہی کر دیا تھا۔

اور جب غالب نے سنا کہ حیدر آباد میں شہید کی اچھی قدر ہو رہی ہے تو انہیں اپنی بد قسمتی کا احساس اور بھی  
ہو گیا۔ وہاں ان کے شاگردوں میں حبیب اللہ کا موجود تھے۔ انہیں خط لکھ کر تفصیل احوال کرتے رہتے تھے۔ حکیم  
غلام نجف خاں کو ایک خط میں لکھا ہے

”مولوی فضل رسول صاحب نے حیدر آباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں  
محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلا یا ہے۔ پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں ان  
کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم کو کچھ معلوم ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔“

۳۸۵/ غالب خط

۴۲۱/ غالب خط

۳۸۵۔ منشی فضل رسول واسطی سندیلوی (متوفی ۱۸۷۹ء) جو رشتہ میں شہید کے بھانجے تھے۔ ان کا دیوان نوکشور سے چھپ چکا  
انہیں مظفر علی اتیر (متوفی ۱۸۸۲ء) سے ملتا تھا (نادر روزنامہ ۳۱)



ان جملوں میں جو طنز چھپا ہوا ہے اس کا اندازہ "سورتی" اور صورتوں کے تلامز سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ مگر  
ح لطف تب آئے گا جب یہ معلوم ہو کہ غلام امام شہید بد صورت تھے، ان کے چہرے پر چمپک کے داغ تھے  
رکانوں میں قرنا لگا کر سنتے تھے۔ مولوی منظر علی نے لکھا ہے:

"مولوی غلام امام شہید... متوطن الہ آباد آج تشریف لائے... شہید صاحب مولود  
خوب پڑھتے ہیں اور وقت پر پڑھنے کے عشق آں حضرت میں بے چین ہو جاتے ہیں۔ لیکن  
افسوس ہے کہ آواز اچھی نہیں۔ بالفعل ان کی عمر ستر برس کی ہے۔ قرنائی لگا کر سنتے ہیں

(۳- اکتوبر ۱۸۷۲ء)

غالب برابر امام شہید کے بارے میں "ٹوہ" لگاتے رہتے تھے۔ ۲۶ اگست ۱۸۷۳ء کو حبیب اللہ ذکا کے موسومہ  
میں لکھتے ہیں:

"اب آپ اس خط کی رسید لکھیے اور اس میں غلام امام شہید کا حال مفصل لکھیے کہ ان کی وہاں  
کیا صورت ہے۔ ایک شخص مجھ سے یوں کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا مگر محی الدولہ نے  
چار سو روپیہ مہینہ سرکار جناب عالی سے مقرر کر دیا ہے۔  
پھر اودھ اخبار میں انہوں نے ایک خبر دیکھی تو جھٹ ڈکا کو لکھا:

"ہاں صاحب، اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام کا دیکھا، مکان تنگ است  
جہاں تنگ است، مدح مختار الملک، میں متضمن استدعا کے مسکن وسیع، پھر مہینے بعد اسی  
اودھ اخبار میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا، مگر تیس روپے مہینہ بڑھا دیا۔ اسی اخبار  
میں پھر دیکھا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے، اور ان کے  
شاگرد و صنیع تخاص نے اس کا جواب لکھا ہے۔ آپ سے اس رویداد کی تفصیل اور جواب  
اعتراض و مترض کے نام کا طالب ہوں۔ بہ سبیل استعجال۔ (۱۱ جنوری ۱۸۷۶ء)

اچھا، لطیفہ یہ ہے کہ ذکا نے شہید کو بتا دیا یا انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا، کہ غالب ان کے بارے میں کیا  
تھے رہتے ہیں۔ اس غریب نے خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کو شکایت لکھی کہ مرزا صاحب مجھ سے بے سبب ناراض  
ہے۔ بے خبر نے غالب کو لکھا کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے۔ شہید پر آپ کیوں وار کر رہے ہیں، اگر کوئی اور ہوتا تو  
یہ غالب جواب میں شہید تو کیا قاتل کو بھی نہ بختے اور خوب کھری کھری سناتے۔ مگر بے خبر لیفلٹنٹ گورنر کے  
منشی اور غالب کے دوست تھے، ان سے ذکا کو ردی تھی غالب نے معذرت لکھی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو یہ  
"منشی حبیب اللہ ذکا کے اشعار آتے رہے اور میں اصلاح دے کر بھجوا رہا۔ بعد وار

سک۔ ہاتھی: ایک نادر روزنامہ ۲۸/

سک۔ قمر: خطوط غالب ۲۶۲/

سک۔ ماسبق

سک۔ ایضاً ۳۲۶/



ہونے مولوی صاحب کے ایک نزل اُن کی آئی اور انہوں نے یہ لکھا کہ مولوی غلام امام شہید اکبر آبادی کی نزل پر یہ نزل لکھ کر بھیجا ہوں۔ میں نے حسب معمول نزل کو اصلاح دے کر بھیجا اور یہ لکھا کہ مولانا شہید اکبر آباد کے نہیں لکھتو اور الہ آباد کے ہیں، یہ س کلے سے زیادہ کوئی بات میں نے نہیں لکھی۔ اس میں سے توہین کے معنی مستنبط ہوں تو میں ان کا مستہزئہ سہی۔ اب نہیں جانتا کہ تنشی صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا؟

ایک بار غالب کے دوست چودھری عبد الغفور سرور نے انہیں لکھا تھا کہ آپ دلی دکن کی مدرج میں قصیدہ کیوں نہیں بھیجتے، وہاں آج کل مین برس رہا ہے۔ آپ کی بھی ضرور قدر دانی ہوگی۔ اس کے جواب میں غالب نے لکھا تھا:

پہلے کچھ باتیں کہ بادی النظر میں خارج از بحث معلوم ہوں گی۔ لکھی جاتی ہیں: میں پانچ برس کا تھا کہ میرا پیرا، نو برس کا تھا کہ چامڑا۔ اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپے سال مقرر ہوئی انہوں نے نہ دیے۔ مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساٹھ سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کوبرک صاحب بہادر ریڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکریٹری بزرگ نامگاہ مر گئے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکاسے بہ صلہ مدح گسٹری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی سو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دوہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ایسے طالع محسن سوز و مرنی کش کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں دلی دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور دلی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور یہ سب باتیں وقوعی و داعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدہ کا قصد کروں۔ قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں۔ تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی۔ اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع



گو یا میری زبان سے ہے :

عالم سمہد افسانہ ما در دو ما، میچ

پایان عمر ہے، دل و دماغ جواب دے چکے ہیں، سو روپے رام پود کے ساٹھ روپے نیشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور رزانی امور عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قفلے کے قفلے آمادہ رحیل ہیں۔ دیکھو نشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ماورگدشتہ میں گذر گئے۔ مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں۔ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں۔ قصیدہ لکھوں، آپ کے پاس بھیجوں۔ آپ دکن کو بھیجیں، متوسط کتب پیش کرنے کا موقع پائے پیش کیے پر کیا پیش آئے۔ ان مراحل کے طے ہونے تک میں کیوں کر بیوں گا۔

اِنَّ لِلّٰہِ وَاَنَا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا مُوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ

کان اللہ ولم یکن شیء واللہ الان کما کان

یہ خط ۱۸۶۰ء کا ہے اور یہ بادی النظر میں خارج از بحث باتیں انہوں نے تکلفاً ہی لکھی ہیں۔ امواقع یہ ہے کہ وہ یاسر حیدر آباد سے انتقال کی برابر کوشش کرتے رہے مگر مطلب برآری نہ ہو سکی۔ جلیب اللہ ذکا کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

”صنعتِ سہل محتجہ میں، میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا کچھ قدر دانی نہ فرمائی، ردِ فرقہ وہاں یہ میں ایک مثنوی کے جو سابق میں لکھی تھی، وہ محی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی، اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید، شاگرد قلیل، وہاں کو سنا، انا ولا غیر، بجا رہے ہیں اور سخن نا شناسوں کو اپنا زور طمع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر کی عمر میری ہوئی سو گز شہرت خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ احسنت و فرحبا کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ شبیر ستاکش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی، نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب مجھ کو کیا سمجھے۔ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے!“

ان اقتباسات سے غالباً واضح ہو گیا ہو گا کہ شہید سے غالب کی برہمی (الف) شاگرد قلیل ہونے کی بنا پر

۱۔ مہر: خطوطِ غالب ۳/۴۶۲۔ [غالب نے مختار الملک کی مدح میں جو قصیدہ بھیجا تھا وہ کلیاتِ نظم میں شامل ہے (طبع سوم نو لکھنؤ ۱۹۲۴ء صفحات ۲۴ و بعد) اور غالب کا دستخطی قصیدہ سالار جنگ میوزم میں محفوظ ہے۔ اسی میں یہ شعر ہے :

کس غیت متاع را خسریدار

نار آنکہ بہا گراں نگویم

۲۔ یہ کلیات نظم کی مثنوی ششم ہے (ص ۹۸) جس کا عنوان ہے : بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ در حقیقت پر تو نور الانوار حضرت الوہیت است اس مثنوی میں ۱۲۸-۱۲۹ اشعار ہیں۔



(ب) سخن ناشناسوں میں مقبول ہونے کی وجہ سے (ج) حیدر آباد میں ان کے علی الرغم نوانے جانے کے باعث خیر جس زمرہ نے کایہ خط ہے اس وقت تو حیدر آباد کا سلسلہ نہ تھا۔ پہلے دو اسباب ہی تھے چنانچہ سرسید شہید کے دو شعر لکھ کر تضمین کی فرمائش کی تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آپ کا خط آنے سے تو خوشی ہوئی مگر کام کا حکم دیا ہے اس سے رنجیدہ ہوا۔ کسی شاعر کے دو ایک شعر لے کر ان پر دو چار شعر اپنی طرف سے طعنا تک دینا کسی شاعری و معنی پروری ہے؟ اور ہو بھی تو یہ دو شعر اس قابل ہی کہاں ہیں۔ ان میں فارسی کے پرتشکوہ لفظوں سے سوا ہے کیا۔ کوئی نازک خیال۔ کوئی باریک نکتہ تو نہ ہے نہیں۔ پھر یہ ایسی بھر میں ہیں کہ کسی ایرانی نے اس میں آج شنادری نہیں کی۔ ان کی تضمین۔ چاہے وہ مسدس ہو یا ترجیع بند بس ایسی کام آ سکتی ہے کہ بھکاری یاد کر لیں اور بھری آواز سے درد رکھتے پھریں اور خاتم المرسلین کا کوئی عاشق شعر سن کر اپنا گریبان چاک کر لے۔ پھر کہتے کہ واللہ مولانا شہید نے بہت عمدہ شعر لکھے ہیں اور ان سے بہتر لکھے نہیں جاسکتے۔ مگر یہ شاعری و معنی پروری ہے۔ مجلس مولود شریف میں پڑھنے کی چیز ہے۔ حضرت اشرف المرسلین علیہ السلام کی نعت میں اس فقیر نے کہ مثنویاں اور قصیدے کہے ہیں ان میں سے ایک مثنوی نقل کر کے آپ کی خدمت میں بھجوا ہوں۔ ذرا اگے ملاحظہ فرمائیے۔ مجھ سے سیدہ معنی پروری کے خلاف کسی قسم کے شعروں کی فرمائش نہ کیجئے۔ اس خط کا ماخذ ایک قلمی نسخہ ہے جس میں بہار دانش وغیرہ مستبد دکتا ہیں۔ یہ انجمن محمدیہ آگرہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اسی کے ایک نسخہ ورق پر کسی نے غالب کا یہ خط نقل کر دیا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک جہر بھی ہوئی ہے جس میں (اصحاح الدین ۱۲۶۷ھ) صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خط غالب کی زبان میں نقل ہوا ہے۔ فارسی متن ملاحظہ ہو۔

(۲)

بنام جواد الدولہ سید احمد خان بہادر منصف فتح پور

نواب معالی القاب و سید عالی جناب سلامت۔

بر رسیدن منشور رافت نشان شادماں شدم، وازاں چہ مرا بسرا نجام آں فرمان طارہ اند غمیں  
یک دو بیت از دیگرے گرفتن و بر آں گفتار دو چار بیت از خویش افزودن کدام آئین  
سخن وری و کدام شیوہ معنی پروری است۔ خاصہ این دو بیت کہ جز تشکوہ الفاظ تازی  
بیچ گوئے معنی نازک ندارد و سیما در بحر واقع شدہ کہ بیچ کس از ایرانیاں در آں بحر غزل گفتہ  
انچہ بریں دو بیت افزانید خواہی آں را بستدس نام نہند و خواہی ترجیع بند خوانند، خاص  
از بہر آنست کہ گدایاں یاد گیرند و بر در ہا با ہنگام خیریں بخوانند۔ کدام عاشق خاتم المرسلین  
بسماع این اشعار از خود رود و گر بہاں درود حاشا ثم حاشا مخدونی مولوی غلام امام شہید۔  
سلمہ اللہ تعالیٰ ہر چہ گفتا اند خوش گفتہ اند و خوشتر ازین نتوان گفت۔ لیکن این شاعری  
و سخن وری نیست۔ چیزے دیگر بہت کہ در مجلس مولود شریف تولا خواند۔ فقیر حقیر را  
در نعت اشرف المسلمین علیہ السلام قصیدہ یا مثنویاں است، اناں جملہ یکے مثنوی



نقل کردہ بخیر مت می فرستم، این را بنگرند و بخوانند و از بندہ اشعار سے کہ نہ شیوہ سخن  
گستراں باشد آرزو کنند و بندہ خود انکار نہ و بخیر مت بہین بہادر خود سلمہ، اللہ تعالیٰ  
سلام رسانند۔ والسلام  
اناسد اللہ

(۳)

اسی کتب خانے میں ایک مجموعہ مثنویات ہے (نمبر ۴۶) جس میں ۲۶ مثنویاں شامل ہیں ان میں ساتی نامہ  
غزت، مثنوی ناصر علی ساتی نامہ الہی، سوز و گداز نوعی، قضا و قدر سلیم، ساتی نامہ لامرشد، ساتی نامہ زکی، قضا و قدر  
حکیم، رکنایح، قضا و قدر سعید، اشرف، اور محسن فانی کی مثنوی موسیٰ و موسیٰ شامل ہیں۔ اسی مجلد میں کلیات نظم  
غالب کے کچھ اوراق ہیں یہ صاف نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ مثنویات پر جابجا مہر بھی ثبت ہیں  
ایک توصیف بڑھی جاتی ہے جس پر دین دیال ۱۲۶۸ھ لکھا ہوا ہے۔ دوسری مہندی میں ہے۔ یہ تہریجی دین دیال  
ہی کی ہے لیکن اس کا سال ٹھیک نہیں پڑھا گیا کہ ۱۸۴۴ء یا ۱۸۴۹ء۔ اس میں مجھے شک ہے۔ بہر حال ان اوراق  
میں ذیل کا قطعہ بھی ملتا ہے جو مرزا میتا بیگ کے قطعہ تاریخ وفات سے قبل درج ہے

رفت چوں مولوی حمید الدین  
از خود از دہر رفت و دہر منور  
سید الانبیاء شفیعش باد  
دخل را چوں نروں گنی برخلد  
داخل خلد گشت پسنداری  
رمز دریاب تا غلط نہ کنی  
خلد خلد است بر لب غالب  
نہیں جہاں کز فنا عمارت اوست  
پر ز آوازہ فضیلت اوست  
کاں سجید ازل ز غرت اوست  
سال فوٹش ہمیں حقیقت اوست  
دخل در خلد سال رحلت اوست  
زاں کہ تکرار خلد صورت اوست  
فکر ہر س بقدر ہمت اوست

اس مادہ تاریخ سے ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) متنبط ہوتے ہیں۔ کلیات نظم سے اس کا اخراج ظاہر مادہ تاریخ  
کے مجوزہ پن کی وجہ سے ہوا۔ غالب تاریخ گوئی سے قاصر تھے اور اس کا انہوں نے منور و ملاحظہ پر اعتراف  
کیا ہے۔ میاں داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:  
”بجائی ممتداری جان اور اپنے ایمان کی قسم کہ فن تاریخ گوئی و ستم سے بے گانہ

۱۔ کلیات نظم فارسی میں غالب کی دو نعتیہ مثنویاں ہیں۔ ایک میں ۵۷۔ اشعار ہیں اور اس شعر سے شروع ہوتی ہے

بنام ایندے کلاک قدسی صریح

بہر خیش از غیب نبر و پذیر

دوسری مثنوی در بیان معراج ۲۷۵ شعروں میں ہے۔ اختصار کی وجہ سے قیاس چاہتا ہے کہ پہلی مثنوی ہی غالب نے  
اس خط کے ساتھ بھیجی ہوگی۔ اسی خط میں نعتیہ قصیدوں کا بھی ذکر ہے۔ کلیات میں ان کے تین قصیدے نعت  
رسول میں ملتے ہیں۔

۲۔ میتا بیگ کی وفات کا قطعہ تاریخ کلیات نظم غالب میں موجود ہے۔



محض ہوں۔ اُردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اور مد کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں حساب سے میل جی گھڑتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا۔ حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈ لیا دیتے موزوں میں کرتا۔ اگر آپ نے مادے کی فکر کی ہے اور یہی حساب جبل منظور کیا ہے تو ایسے قیمے اور خرچ آگئے ہیں کہ وہ تاریخ سنسی کے قابل ہو گئی ہے۔ کلکتہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ ان کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خان نے استدعائے تاریخ کی۔ میں نے لکھی۔ چنانچہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

مفتی عقل انیسے تاریخ ایں بنا

ایسا بسوئے من ز رہ احترام کرد

گفتم بونے بدیہہ: خوشا خانہ خدا

شد خنمگیں دے کہ نظر در کلام کرد

خاشاک رفت دیائے ادب در کجہرخت

ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو۔ خوشا خانہ خدا مادہ پھر اس میں سے خاشاک کے حد در دو کر دو  
نوسوا لیں کا تخرجہ کہ پھر بھی دو اور زیادہ رہے۔ پائے ادب یعنی ب کو اٹایا۔ بھلا ہر  
بھی کوئی تاریخ ہے

یہی حال مذکورہ بالا قطعہ تاریخ کا ہے۔ مادہ تاریخ ان کے عجز کا شاہد ہے۔ مولوی حمید الدین کون تھی، میں اس کی نشان دہی سے قاصر ہوں۔

۱۔ یہ غلط ہے، دیوان اُردو نسخہ عربی میں اُردو کے قطعات تاریخ موجود ہیں (ص ۱۲۳)

۲۔ خاشاک کے عدد تو ۹۲۲ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی غالب نے حساب کی غلطی کر دی۔

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں اُردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق۔ ان کی ابتدائی تعلیم ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء، ان کی تالیف و تصانیف ان کی غزل گوئی و شہنوی نگاری ان کے معاصر شعراء و ادباء ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

قیمت: تین روپے

نگار پاکستان - ۳۳ گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

مصحفی نمبر



# دنیا کے دولاہنحل معے خدا اور کائنات

(نیاز فحوری)

”خدا اور کائنات“ ان کو میں نے دو جدا معے اس لئے قرار دیا کہ عام طور پر ان دونوں کا تصور اسی طرح جدا کیا جاتا ہے جالانکہ دونوں میں ایک ہی چیز اور اگر ہم نے ان میں سے کسی ایک کو بھی سمجھ لیا تو دوسرا از خود سمجھ میں آجائے گا۔ لیکن سوال یہی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے سمجھنے کی کوئی صورت ممکن بھی ہے یا نہیں؟

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کو ناممکن خیال کرتے ہیں کیونکہ اس باب میں ہماری عقل اولیٰ کا زیادہ سے زیادہ نتیجہ صرف یہی نکال سکتا ہے کہ ہم اپنی نارسائیوں کا اعتراف کریں اور بقول بیدل صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں کہ ”اے یافتن ناجستنت“ لیکن یہ بات کچھ مقصودانہ ہو جائے گی اور اس وقت میرا مقصود ”تصوف“ سے ذرا ہٹ کر اس مسئلہ پر غور کرنا ہے۔

خدا اور اس کے تمام مترادفات الفاظ خواہ وہ کسی زبان کے ہوں ایک ہی تصور ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ تصور قریب قریب دلیسا ہی ہے جیسا دوسری مادی ہتھیار کا اور ہم اس پر سچ پوچھے تو ایک طرح مجبور بھی ہیں کیونکہ انسان فطرتاً محسوسات مادی ہی کی وساطت سے غیر محسوسات تعقل کر سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ترقی یافتہ مذاہب عالم نے خدا کا تصور بڑا اچھا پیش کیا، یعنی یہ کہ قادر مطلق ہے۔ خالق بے ہمتا ہے۔ لیکن آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ خدا کا یہ تصور محض صفاتی ہے یعنی یہ کہ وہ کیسا ہے؟ لیکن کون اور کیا ہے؟ کا سوال بدستور اپنی جگہ پر قائم رہا۔

کہا جاتا ہے کہ جس طرح ایک مطلق العنان بادشاہ اپنے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے اسی طرح خدا بھی سارے جہاں کا مختار کل ہے۔ لیکن مائے غور کریں کہ انسان نے خدا کا یہ تصور کیوں پیش کیا۔ اس کے سمجھنے کے لئے ہم کو انسان کی فطرت اور اس کے قدیم تاریخ کو سامنے رکھنا پڑے گا۔

دنیا کی ہر جاندار مخلوق چونکہ فانی مخلوق ہے اس لئے فطرت کی طرف سے اپنی بقا اور ہلاکت سے بچنے کی حس بھی اسے عطا ہوئی ہے یعنی وہ زندہ رہنے کے لئے اسباب زندگی فراہم کرنے اور ہلاکت سے بچنے کے لئے مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ابتداء گہرا آفریت میں بھی جب وہ غاروں اور صحراؤں میں زندگی بسر کرتا تھا تو اس نے اپنے آپ کو درندوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اور جب وہ آہستہ آہستہ ترقی کر کے عائلی زندگی میں داخل ہوا تو اس نے خود اپنی جنس کے قومی افراد کی مدد حاصل کرنے کے لئے ان کو بھی خوش رکھنا ضروری سمجھا۔ اسی کے ساتھ اسے حوادث طبعی کا بھی سامنا کرنا پڑا مثلاً طوفان، بجلی، زلزلہ وغیرہ اور جب وہ اس کے اسباب معلوم کرنے اور ان سے محفوظ رہنے کے لئے اس نے اپنے آپ کو مجبور پایا تو اس نے سوچا



کہ یہ حوادث ضرور کسی ایسی بڑی ہستی سے تعلق رکھتے ہیں جو ان کے خاندانی سرداروں سے زیادہ قوت والی ہیں اور اس کو خوش رکھنے کے لئے بھی انسان نے وہی صورتیں اختیار کیں جو اپنی ہم جنس قومی افراد کی خوشی حاصل کرنے کے لئے اختیار کر سکتا تھا۔ خود کا بقا حیات کے لئے سب سے اہم مسئلہ فراہمی غذا کا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ جس طرح دعوتوں و ضیافتوں کے ذریعہ سے وہ اپنے ہم جنس قومی افراد کو خوش رکھ سکتا ہے اسی طرح وہ حوادث طبعی پیدا کرنے والی ان دکھی ہستی کے غصہ کو بھی کم کر سکتا ہے۔ یعنی اگر وہ ہستی ان کی ضیافتیں قبول کرنے کے لئے سامنے نہیں آسکتی، تو کیوں نہ اس کی غائبانہ دعوت کی جائے اور یہ بھلا وہ اولین جبر جس نے سب سے پہلے قربانی کی رسم دنیا میں قائم کی۔ کیونکہ انسان سمجھتا تھا کہ اگر میں اس کے نام پر کوئی جانور ذبح کر دوں گا، تو اس کا معنی یہ ہوں گے گویا اس نے ہماری دعوت قبول کر لی اور اس طرح وہ خوش ہو جائے گی۔ الغرض انسان نے ادل اول خند تصور ایک انسان ہی کی طرح کیا اور انسان ہی کی حیثیت سے اس کو یاد کیا سمجھا اور تملق و خوشامد سے اس کو خوش رکھنا چاہا اور اس سلسلے میں قربانیوں کے علاوہ اس نے خدا کی فرضی و خیالی صورتوں کے بت بھی تراشے اور ان کے سامنے جھک جھک کر اور ہاتھ جوڑ کر اپنی بیپارگی کا اعتراف کرنے لگا۔ یہاں تک کہ امتداد زمانہ کے ساتھ قربانی اور بت پرستی انسانی زندگی کا جزو قرار پا گئی۔ یہ تھی بنیاد مذہب کی اولین تحریک جس نے بعد کو معابد تو بے شک طرح طرح کے پیدا کر دیے لیکن خدا کا تصور مادیت علیحدہ نہ ہو سکا۔ یعنی وہ ایک بہت بڑا صاحب قوت بادشاہ یا مالک سمجھا جانے لگا جو ایک بادشاہ ہی کی طرح خوش بھی ہو سکتا اور برہم بھی، جو خوش ہونے کے بعد انعام دے سکتا ہے اور ناخوش ہونے کے بعد سزا بھی۔ چنانچہ دوزخ و جنت وغیرہ کا تصور بھی اسی انعام و سزا کا مادی تصور ہے۔

یہ تو ہوئی انسانی خیال کی وہ صورت جب انسان نے خدا کے وجود اور اس کی قوت کو سمجھنا چاہا محض اپنی بیپارگی کو سوا رکھ کر گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھے کہ خدا نام قرار پا یا محض اپنی مجبوری کا جس کا اظہار بیدل گئے اس طرح کیا ہے کہ:

علاج نیست داغ بندگی را

اور اکبر نے ان الفاظ میں کہ:-

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

ہر چند مذاہب عالم کا تصور اب بھی وہی ہے اور وہ اس دائرے سے ابھی تک باہر نہیں نکلے لیکن خدا کو علمی و عملی نقطہ نظر سے سمجھنے کی بنیاد بھی بہت پہلے پڑ چکی تھی اور اس کی داستان بھی کم دلچسپ نہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ انسان کو جب ادل اول حوادث طبعی سے واسطہ پڑا تو اس نے ان حوادث کا سبب کسی بادشاہ نما ہستی کو قرار دے کر اس کو خوش کرنے کے لئے قربانیاں چڑھائیں۔ پرستش گاہیں تعمیر کیں اور جتنی خوشامد وہ خدا کی کر سکتا تھا اس نے کی۔ لیکن جب اس کے بعد بھی اس نے دیکھا کہ خدا خوش نہیں ہوتا اور آفات ارضی و سماوی کم نہیں ہوتے تو اس نے سوچا کہ خدا نے اسے پیدا تو کر دیا ہے لیکن غالباً اس کے زندہ رکھنے کا وہ ذمہ دار نہیں اس لئے وہ مجبور ہو کہ حوادث سے بچنے اور زندہ رہنے کے لئے وہ خود بھی کوئی تدبیر اختیار کرے اور یہی رجحان گویا آغاز تھا تمدن انسانی کے قیام اور عملی فکر و تعقل کا۔

اس نے شدید موسم سے بچنے کے لئے جھونپڑے بنائے۔ سیلاب زدہ کپنے کے لئے پتھروں کے ڈھیر اس کے راستہ میں حائل کئے، کھیتوں کو خشک سالی کی تباہیوں سے بچانے کے لئے، پانی کی فراہمی کے لئے اس نے گڈھے کھودے، تالاب بنائے۔



تن پوشی کے لئے اس نے کھالوں کی کاٹ چھانٹ شروع کی اور غلہ پیدا کرنے کے لئے زراعت و آلات زراعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ الغرض جب اس نے دیکھا کہ خدا کی محض خوشامد سے کام نہیں چلتا تو وہ فکر عمل کی طرف متوجہ ہوا لیکن خدا کے تصور کو اب بھی وہ دل سے نہ نکال سکا کیونکہ جب وہ سوچتا تھا کہ باوجود اپنی انتہائی تدابیر و مساعی کے وہ ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا تو اس کا کوئی نہ کوئی ایسا سبب جو اس کی فہم و اختیار سے باہر ہے۔ ضرور ہونا چاہئے اور یہ سبب اس کے نزدیک خدا یا کسی بالا دست ہستی کے سوا، کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بہر حال انسان کی فکر و عمل کا یہ غیر یقینی دور اس طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ وہ آیا جب کثیر و متعدد تجربات کے بعد اپنی بعض ناکامیابیوں کے اسباب و وجوہ بھی اس نے معلوم کرنا شروع کئے اور اس طرح رفتہ رفتہ خدا کے "سبب الاسباب" اور "علتہ العلل" کا نظریہ ضعیف ہونے لگا۔ یہاں تک کہ جب فکر و عمل کی مضبوطی و ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی کامیابیاں بھی بڑھنے لگیں تو اس نے سمجھ لیا کہ اس کے دنیاوی اعمال اور کاروبار سے خدا کا کوئی تعلق نہیں اور اس طرح مذہب و عقل کا تصادم شروع ہو گیا اور اس کی شدت بڑھتی بڑھتی رہی یہاں تک کہ جب علم الافلاک، علم الحج، طبیعیات، کائناتی اشعہ اور اجزاء مادی کے برقی تعاملات کی تخلیق کے سلسلہ میں جدید اکتشافات سامنے آئے تو ایک جماعت عقل پرستوں کی ایسی پیدا ہو گئی جس نے خدا کے اس تصور سے جسے مذاہب عالم نے پیش کیا تھا۔ انکار کر دیا۔ کیونکہ مذہبی ذرائع سے جو معلومات اسی باب میں ان کو حاصل ہوئی تھیں وہ بہت محدود تھیں اور کار کاہ خداوندی جو پہلے کرہ زمین تک محدود تھی بہت زیادہ وسیع ہو گئی اور خدا نام ہو گیا ایک ایسی عظیم و جلیل قوت کا جو نہ صرف کرہ زمین بلکہ تمام کائنات کی ناقابل قیاس وسعت میں بے شمار طریقوں سے ہر وقت کار فرما ہے۔ ہر چند اس طرح خدا کا نشانہ تصور تو ختم ہو گیا لیکن اس کی جگہ ایک دوسرے تصور نے لے لی جو زیادہ موزوں اور حقیقت سے زیادہ قریب تھا اور یہ تصور وہی تھا جسے قرآن میں لفظ رب العالمین سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ مفکرین عہد حاضر خدا کے منکر ہیں یا بانی ہیں۔ درست نہیں بلکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ انھوں نے خدا کے منصب ملکیت کو منصب ربوبیت میں تبدیل کر دیا اور اس کا مطالعہ زیادہ وسیع زاویہ سے کرنے لگے۔ مذہب نے خدا کا جو تصور پیش کیا تھا وہ بہت محدود تھا اور مفکرین کا تصور بڑا وسیع اور بہت گہرا ہے۔

## اقبال نمبر

سالنامہ ستمبر ۱۹۶۲ء

جسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نام نامی پر موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کے آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت - تین روپے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳



# تذکروں کی روایات بیسویں صدی میں

(ملک اسماعیل حسنین)

اردو ادب نے فارسی کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ اور اپنے ابتدائی دور میں فارسی ہی کے زیر اثر ترقی کی منزلیں طے کیں۔ فارسی کے نمونے اس کے سامنے تھے۔ فارسی ہی روایات سے اس نے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا قدیم لٹریچر فارسی ادب کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ ہر فنکار کی ہر تخلیق فارسی خیالات و نظریات اور تجربات و روایات سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ فارسی ادب میں تنقید کا کوئی خاص ارتقا نظر نہیں آتا۔ عربی کے توسط سے جو خیالات و نظریات اس تک پہنچے۔ اس نے انھیں کوایا اور چند روایات قائم کر لیں۔ جن میں تبریلیوں کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی، صدیوں کی قائم شدہ آہنی فرسودہ روایات کے زیر اثر کبھی کبھی تنقیدی خیالات کا اظہار ہوتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کی تنقیدی روایات، بالکل میکانیکی ہو گئیں۔ چند خاص خیالات تھے۔ چند خاص اصطلاحات تھیں، چند منتخب کلمے تھے، جن کے استعمال کر دینے کو تنقید سمجھا جاتا تھا۔

اردو میں تنقید کا آغاز تذکرہ نویسوں سے ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب معاشرت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ برسوں کے تربیت یافتہ سماج و تہذیبی اصول مجبور یوں کی نذر ہو رہے تھے۔ پیہم حادثات اس مخصوص تہذیبی زندگی کا راستہ کاٹ کاٹ جاتے تھے۔ جبر کے نظریہ نقوش میں سلف نے خون جگر سے رنگ آمیزی کی تھی۔ لیکن ساری شکست و ریخت کے باوجود کسی کو اچھا کہنے کے لئے جو مرصع، رنگ و ہنر اور پردہ دار الفاظ متعین تھے۔ ان کا استعمال ضروری سمجھا جاتا تھا۔ قدیم تذکروں کی سیر کر جائے آپ کو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے ہفت رنگ پر دوں میں شخصیت اور ادب کی حقیقتیں مبہم خیالات ہو کر رہ گئی ہیں۔ فارسی کی طرح وہ بھی ایک خاص سماج نظام کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ وہ بھی فارسی کی تنقیدی روایات کی طرح چند جملوں، فقرہوں اور الفاظ تک محدود ہیں لیکن اس کے باوجود ان تذکروں میں اس دور کے شعرا کے متعلق کہیں کہیں کوئی نہ کوئی ایسی بات بھی ضرور محفوظ ہے جس کی مدد سے حقائق کا سراغ لگ جاتا ہے۔ اس طرح ساری خامیوں کے باوجود یہ تذکرے اب بھی سینے سے لگا کر رکھنے کی چیز ہیں۔

تذکرے اس عہد کی یادگار ہیں جب شاعری کو فن شریف سمجھا جاتا تھا۔ ایک خاص معیار تھا جس پر شاعر کا پورا اترنا ضروری تھا۔ میر و سودا سے لے کر شیفتہ تک یہ معیار اسی طرح قائم رہا۔ حادثات پیہم سے اس کو کھٹو کریں لگیں، لیکن اے دھانچے میں کوئی نمایاں فرق یا تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ میر نے جہاں شاعری کو فن شریف کہتے ہوئے یہ کہا تھا کہ شاعری کو کام اور باشوں سے کیا اُس کو بزازوں سے نہ افوں سے کیا

تو اس کے کافی عرصہ کے بعد شیفتہ نے جب اپنا تذکرہ مرتب کیا تو یہ کہتے ہوئے (جس طرح افلاطون نے اپنی جمہوریت شاعروں کو نکال دیا تھا) کہ اشعار، بسیار دارد کہ بر زبان سوتیین جاری ست و نظر بہ آل ابیات در اعداد شعر انشا بدش شمر د



اپنے تذکرہ سے نظیر کو خارج کر دیا۔ شاعری کے متعلق شیفتہ کا نظریہ کچھ اور تھا۔ جس کو انھوں نے اپنے بعض اشعار میں بیان کیا ہے۔ مثلاً -

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ  
معنی شگفتہ - لفظ خوش، انداز صاف ہو

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نام مقبول  
اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو

یہی وہ معیار تھا جو میر سے لے کر شیفتہ تک قائم رہا اور اسی کو میر نے "فن شریف" کے نام سے یاد کیا ہے، یہی وجہ تھی کہ تذکروں میں لفظی اور اسلوبی خوبیوں پر سارا زور قلم صرف کیا جاتا تھا اور اشعار کی معنویت درجہ دوم کی چیز سمجھی جاتی تھی، اس کا ذکر آگے ہو گا۔

تذکروں سے پہلے ہمیں بیاضوں کا سلسلہ ملتا ہے۔ بیاضوں میں لوگ اپنی اپنی پسند کے اشعار لکھتے تھے۔ اس کے بعد بعض لکھنے والوں نے منتخب اشعار کے ساتھ ساتھ شاعر کا نام بھی لکھ دیا اس کے کچھ حالات بھی درج کر دئے اور اس طرح تذکرہ نگاری کی ابتدا ہوئی، ظاہر ہے کہ یہ تذکرے لکھنے والے زیادہ تر خود اپنے لئے لکھتے تھے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے لکھتے تھے۔ اس لئے ان کے اندر کسی باضابطہ تنقیدی شعور کی تلاش کرنا ان کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ ان تذکروں کو آج کے پیمانہ تنقید سے ناپنا انصاف سے بعید ہے۔ سرور صاحب کے بقول: "یہ تنقیدی شعور بعض اچھی روایات کا حامل تھا۔ اس میں فن کی نزاکتوں کا احساس تھا، اور اس کی خاطر ریاض کرنے کا احترام، یہ قدر محدود اور روایتی تھا، اور ضبط و نظم کا ضرورت سے زیادہ قایل۔ یہ ہر شیب و فراز کو ہموار کرنا چاہتا تھا اور ہر ذہن کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا جانتا تھا، یہ بات اشاروں میں کرتا تھا، وضاحت، ہر احوال کی تفصیل کا قایل نہ تھا، اس میں مدح ہوتی تھی یا قدح اس کا معیار ادبی کم تھا فنی زیادہ۔" یہ ضرور ہے کہ اس عہد میں تنقیدی شعور عہد حاضر کی طرح پیدا نہ ہوا تھا، اس کو تنقید کے نام سے نہیں پکارا گیا۔ مگر اس میں تنقید کے عناصر کسی حد تک موجود تھے۔ یہ عناصر کہیں زیادہ نمایاں ہو جاتے، کہیں صرف جھلک کر رہ جاتے، صرف اتنی ہی تنقید اس ابتدائی دور کے لئے کافی تھی، سرور صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ: "اُردو میں وجہی سے لیکر حسرت موہانی تک ہر اچھے شاعر کا ایک واضح اور کارآمد مودہ تنقیدی شعور بھی ہے۔"

اُردو میں جتنے تذکرے لکھے گئے ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ دما سی کا خیال ہے کہ میر کے تذکرے سے پہلے کئی تذکرے موجود تھے۔ مثلاً خان آرزو کا تذکرہ اور دوسرا سودا کا تذکرہ۔ لیکن خان آرزو اور سودا کے تذکرے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میر کے تذکرہ "نکات الشعرا" کو سب سے پہلا تذکرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کی تقلید میں بعد کو متعدد تذکرے لکھے گئے اور جن میں اکثر کا ماخذ میر کا "نکات الشعرا" ہی ہے۔

قدیم تذکروں نے بیسویں صدی کے ادب پر جو اثرات ڈالے، اور زبان و اسلوب کی تطہیر و تزئین میں جو حصہ بیا دہ بہت اہم ہے، ان تذکروں نے ادب کے ظاہری پہلو پر اتنا زور دیا کہ معنوی پہلو نظر سے تقریباً اوجھل ہو گیا، لیکن جدید ادب میں اصل چیز فن کی افادیت قرار پائی اور اس طرح رد عمل کے بطور زبان و اسلوب کی افادیت و اہمیت کو رجعت پسندی، قدامت پرستی اور بورژوائیت کا پروردہ سمجھ کر اس سے حتم پوشی کی جانے لگی۔ جدید نقادوں میں سے بیشتر نے یہ سمجھ لیا کہ اصل چیز شعر کی روح یا معنویت ہے۔ اور اسلوب و ہیئت تو اس کا جسم ہے، اس لئے روح پر خاص نظر رکھنا چاہئے۔ جسم نہ ہو جب بھی روح کی نیرنگی ارباب بصیرت کے لئے کافی ہوں گی، وہ مواد کی سہا جیت کے سامنے اقبال کے بقول "ارتباط لفظ و معنی، ارتباط جان و تن" کے فارمولے کی اہمیت کو کھل کر میلوں آگے نکل گئے۔



تذکروں میں یہ ضرور ہے کہ زیادہ تر محاورہ و عدد صنف سے بحث ہوتی تھی۔ مواد سے زیادہ مہیت کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی اور معنی سے زیادہ الفاظ پر گرفت رہتی تھی لیکن اس کا ایک نتیجہ ضرور اچھا ہوا کہ اشعار میں صحت زبان کا زیادہ خیال رکھا جانے لگا اور زبان میں صفائی و شستگی زیادہ آتی چلی گئی۔ اگر یہ تنقیدیں اس صورت میں اس وقت نہ کی جاتیں تو آج اردو زبان جس پر ہم کو بہت کچھ ناز ہے اس صورت و لباس میں ہم تک نہ پہنچتی جس میں ہم اسے آج دیکھ رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ معنی کا خون کیا گیا مگر زبان و فن کی آراستگی میں ان تنقیدوں کا بڑا حصہ ہے اور اس وقت جبکہ زبان ارتقا کے ابتدائی منازل طے کر رہی تھی اس بات کی سخت ضرورت بھی تھی کہ جہاں تک ہو سکے زبان کو صاف کیا جائے اس میں وسعت، ہمہ گیری اور لوح پیدا کیا جائے، ان تذکروں سے جہاں ان تذکرہ نویسوں کی دیدہ وری و سخن سنجی کی مخصوص صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے وہاں ادب و تنقید کے ایک طالب علم کے سامنے یہ پہلو بھی آجاتا ہے کہ شعر کی خوبی، تاثیر اور تکمیل میں الفاظ و اسالیب کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

جدید تنقید اور تذکروں کے درمیان کی تصانیف اور ان کے لکھنے والوں کے افکار کا مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ وہ حضرات بھی شعر کے لباس یا جسم کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کرتے، اس عہد کے نقادوں میں محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی نے مواد کے ساتھ شعر کی ہیئت اور اس کے اسلوب پر بھی زور دیا ہے، اس لئے کہ ”کیا کہا جائے اور کیسے“ ان دونوں کی بنیاد پر شعر کی عظمت و بقا کا دار و مدار ہے۔ اگر ان میں سے ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو حقیقت معلوم۔ شبلی نے شعر العجم میں جہاں شعر کی حقیقت اور شاعری کے اصلی عناصر وغیرہ سے بحث کی ہے وہاں انھوں نے ابن رشيق کا یہ قول نقل کرتے ہوئے کہ لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے، اہل فن کے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے، جن میں ایک لفظ کو اور دوسرا مضمون کو ترجیح دیتا ہے اور کہہ رہا ہے کہ زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے کیونکہ مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعری کا معیار و کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے اور بندش کیسی ہے۔ حالی جیسا مغرب و نقاد بھی جہاں شعر کی ماہیت و اصلیت سے بحث کرتا ہے تو تذکروں کے اثرات سے اپنا دامن نہیں بچا پاتا۔ وہ لکھتے ہیں :-

”شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے، اس قدر معانی پر نہیں، معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمرہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں، ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے، اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابل تحسین ہو سکتا ہے۔“ اس کے بعد حالی نے ابن خلدون کا قول نقل کر کے اپنی بات کو زیادہ واضح کر دیا ہے وہ لکھتے ہیں :- ”الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ اور معنی کو ایسا سمجھو جیسے پانی۔ پانی کو چاہو سونے کے پیالے میں بھر لو چاہو چاندی کے پیالے میں۔ اور چاہو کانچ یا بلور یا سیپ کے پیالے میں اور چاہو مٹی کے پیالے میں پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے یا چاندی کے پیالے میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالے میں کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح معانی کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہے۔“

تذکروں کی تنقید کے یہ اثرات دور جدید تنقیدی سرمایہ پر بھی نظر آتے ہیں اگرچہ جیسا سطور بالا میں عرض کیا گیا اس دور میں شعر کی ظاہری خوبیوں کی طرف کم توجہ دی گئی اور اصل مقصد فن کی روایت ہی کو سمجھا گیا لیکن اس عہد میں بھی بعض اعتدال



قادوں نے مواد اور ہیئت دونوں کے تعلق اور اہمیت کو ضروری سمجھا اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ نہ صرف مواد سے کام چل سکتا ہے اور نہ محض شکل و صورت سے بلکہ کسی نہ کسی تناسب سے دونوں کا ربط فن کا لازمی عنصر ہے۔ ان نقادوں میں نمایاں نام نیاز خجوری، اثر لکھنوی، اختر تلہری اور رشید حسن خاں کے ہیں۔

نیاز فتح پوری کی تنقیدوں کو خواہ تاثراتی کہا جائے یا جمالیاتی تنقید کے ذیل میں رکھا جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے ردِ تنقید کو مغربی تقلید کے شباب کے دور میں بھی وہی اصول اور پیمانے عطا کئے جو ہم کو تذکرہ نویس بزرگوں سے ملے تھے۔ ان کے خیال میں شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ معائب سے پاک ہو۔ ہم کو تذکروں کے اصولوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کے سلسلہ مالہ و ماعلیہ کا مطلب شاعروں کو ان کی غلط فروشیوں سے آگاہ کرنا تھا، یعنی وہ جس طرح مغرب کی تقلید کے تحت اپنی زبان کے مزاج اور اس کے اصولوں کو نظر انداز کر رہے تھے نیاز صاحب نے ان کے خلاف آواز اٹھائی اور شعرا کو نثر اکتوں کی طرف متوجہ کیا کہ شعر کی ظاہری خوبی کے بغیر شعر کی صورت کیسی مکروہ ہو کر رہ جاتی ہے، اور تاثر فنا ہو جاتی ہے۔ ان قسم کی تنقیدوں سے ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ ادب میں بے راہ و ردی نہ پھیلنے پائے یا ادبی نراج (Amateurism) فتنہ سر نہ اٹھائے اور سن رسیدہ اور کہنہ مشق اور ممتاز شاعروں کی کج زبانیاں اور غرضیں آنے والی نسل کے لئے دلیل راہ کا سبب نہ بنیں۔ ان کے سلسلہ "مالہ و ماعلیہ" نے بہت سے شعرا میں فنی بصیرت پیدا کی، بہتوں کو گمراہ ہونے سے بچایا۔ ان میں زبان و عروض اور قواعد دانی کا شوق پیدا کیا اور بہتوں میں شعر فہمی اور شعر گوئی کا پاکیزہ مذاق پیدا کیا۔ ڈاکٹر عبد اللہ نیاز صاحب کے متعلق لکھتے ہیں۔ "انھوں نے "نا تمام" اور "نارسا" شاعری کی سخت گرفت کی ہے۔ انھوں نے اس سہل انگاری کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے جو شاعر کو اس کے فن کے بارے میں کام چور بنا دیتی ہے۔ شاعری کے چمن میں "سبزہ بیگانہ" کی نمود نیاز کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور سبزہ بیگانہ سے مراد وہ کھردری بے ساختگی ہے جو شاعر کو اپنے کلام پر نظر ثانی سے روکتی ہے۔ ادب میں وضع داری کا سوال یا ادب میں خوش پوشی کی اہمیت جس سے مراد فقط یہ ہے کہ ادب کے لباس یعنی زبان و بیان و ہر حال حسین ہونا چاہئے۔ نیاز نے زبان و بیان کے حسن پر بھی زور دیا ہے اور زبان و بیان کی بلاغت اور رسائی پر بھی۔" نیاز اسکول میں اور بھی کئی اشخاص ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے زبان و فن کی اہمیت پر خاص زور دیا ہے، اور مغربی تقلید کے اس دور اور ان حالات میں جبکہ اردو ادب محشرستانِ خیال ہو رہا تھا، ادبی احتساب کے دائرے کو وسیع کیا۔ ان میں اثر لکھنوی، مولانا اختر تلہری اور رشید حسن خاں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اثر صاحب نے اپنی عملی تنقیدوں (اثر کے تنقیدی مضامین - چھان بین وغیرہ) میں الفاظ و اسالیب کی اہمیت پر بہت زور دیا۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون اقبال اور اندازِ بیان شمولہ چھان بین اور فراق پران کی تنقید میں خاصی خیال انگیز ہیں، وہ شاعری اور تنقید دونوں میں قدیم اصول اور قدیم نظریات کے متبع ہیں، لیکن حیرت ہے کہ وہ جدید دور کی فضا میں سانس لینے کے باوجود اپنی تنقیدوں کو تذکروں کے معیارِ تنقید سے بلند نہ کر پائے یعنی ان میں نیا پن پیدا نہ کر سکے، جو ہمیں نیاز یا دوسرے نقادوں مثلاً مولانا تلہری کے یہاں ملتا ہے۔ ان کا اندازِ تنقید کچھ اس طرح کا ہے کہ "وہ محاورہ کتنا اچھا نظم ہوا ہے۔" "یہ شعر آپ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔" "بندش کی جتنی قابلِ داد ہے۔" "اس محاورہ کی ممکنہ کیا کہنا؟" "یہ بات دائرہ زبان سے خارج ہے۔" "یہاں فصاحت کا خون ہو گیا ہے۔" یا اپنی ایک کتاب "انیس کی مرثیہ نگاری" میں انیس کے ایک بند کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔ "اب آنسو ہی نہیں رکتے۔ آگے کچھ لکھا جائے۔" وغیرہ۔ وغیرہ۔ رشید حسن خاں کے بقول "عملی تنقید کے اس جہاد میں حضرت اثر لکھنوی نے کبھی بہت اہم



حصہ لیا، لیکن نیاز صاحب کی حیثیت شریک غالب کی ہے، جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کے علاوہ اور کسی نے عملی تنقید کو اندازِ مستقل کی حیثیت سے نہیں اپنایا اور نہ اس تفصیل نگاری سے کام لیا۔

رشید حسن خاں بھی اسی دبستانِ نیاز کے ایک فرد ہیں، اُن کے تنقیدی اصول بھی مشرقی ہیں اور اُن پر بھی تذکروں کے اصولوں کی چھاپ ہے۔ لیکن انھوں نے ان کو جدید فضا و ماحول سے ہم آہنگ (Modernise) بھی کیا ہے، ان کی تنقیدوں میں ان صاحب سے زیادہ شگفتگی، تسلسل، روانی، گہرائی اور غیر جانبداری نظر آتی ہے۔ بلکہ وہ کہیں کہیں اختر تلہری سے بھی پیش پیش ہیں انھوں نے اپنے ہر مضمون میں اسی بات پر زور دیا ہے کہ جب تک شاعر کی نظر طریقہ اظہار اور زبان و بیان کے نکات پر نہیں ہوگی، اور جب تک ابلاغ (Communication) کے مسائل پر غور نہ کیا جائے گا۔ تب تک شاعری میں بات بننا مشکل ہے اور اس وقت تک شاعروں کو اسی قسم کی لغزشوں اور عجیبیان سے سابقہ پڑے گا جیسا کہ زبان و فن اور الفاظ و اسلوب کے نزاکتوں سے بے نیاز ہو کر پڑ رہا ہے۔ اسلوب، طرزِ بیان اور الفاظ و زبان پر اُن کا زور دینے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ شاعری میں فنی پہلو ہی سب کچھ ہے اور معنوی پہلو یا مواد و خیال کو کوئی اہمیت نہیں، بلکہ جیسا اوپر عرض کیا گیا کہ انھوں نے خیال و مواد کی ادینت کو تسلیم کرتے ہوئے بیان و زبان کے پہلو کو نظر انداز کر دینے کے قابل تصور نہیں کیا اور نیاز صاحب کا یہ قول سامنے رکھا کہ ”شاعر پیدا ہوتا ہے، بنتا نہیں، لیکن اگر شاعر اس نظریے پر بھروسہ کرے کہ شعر کہے تو وہ بگڑ بھی جاتا ہے“ ذیل کے اقتباسات سے اُن کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

۱۔ اجزائے شعر میں مفہوم اولین اور بنیادی چیز ہے اور اس کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا ضروری ہے لیکن صرف خیال، نظر رکھنا اور اسلوب بیان و طرزِ ادا، جو اس کے اظہار کا ذریعہ ہیں اُن کی طرف سے قطع نظر کر لینا بھی بنیادی غلطی۔ تخیل اور مفہوم کی حیثیت خام مال کی سی ہے کہ اس کے بغیر کوئی چیز تیار نہیں ہو سکتی۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے لیکن اسلوب بیان اس کا سانچہ ہے، اگر سانچہ غلط یا ناقص ہوگا تو چیز بھی ناقص تیار ہوگی۔

۲۔ فن اور اس کے ضابطے خاص ذہنی کاوش چاہتے ہیں۔ ایک ایک مفہوم کے لئے متعدد الفاظ، مصطلحات، محاورات، مرکبات ہوتے ہیں، ان سب میں فرق کرنا، ہر لفظ کے محل استعمال اور اس کا باہمی فرق ذہن نشین کرنا، معانی و بیانیہ کے قاعدوں کو پیش نگاہ رکھنا، اور ان سب رعایتوں کے بعد شعر کہنا خاصا مشکل کام ہے، اگر ادب کا فنی و جمالیہ پہلو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ساری جگر کاوی کرنا ہی پڑے گی۔

۳۔ جدید شعرا میں یہ عام اور مستقل عیب ہے کہ وہ نفسِ خیال پر اتنی توجہ رکھتے ہیں کہ اسلوب و اظہار کے محاسن کی طرف توجہ مستقل ہی نہیں ہو پاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غزل جو آئینہ بازک سے بھی کچھ زیادہ ہے غیر متناسب اندازِ بیانیہ اور بے جوڑ الفاظ و مرکبات کا مجموعہ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جدید شعرا کی غزلیں ان خوبیوں سے یکسر محروم ہیں جن کے بغیر حسن معیار کا ابتدائی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ یہ سچ ہے کہ پرانے تنقیدی خزانے میں الفاظ کے موتیوں ہی کی آب و تاب نمایاں اور خیال کے جوہر نا تراشیدہ ہیروں کی طرح چمک دمک سے محروم ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پرانے شاعر خیال کی دولت سے تہی داماں تھے، نہیں، وہ الفاظ کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف تھے وہ سمجھتے تھے کہ خیال اگرچہ اصل چیز ہے لیکن الفاظ اس کا سانچہ اگر سانچہ فدا ٹیڑھا میڑھا، آڑا تر چھا ہوگا تو شعر بھی بے ہنگم نکلیں گے، وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ شعر



فاظ کی دہی حیثیت ہے جو تصویر میں لکیروں کی کہ اگر چند خطوط بھی غلط زاویے سے کھینچ دئے جائیں تو زیادہ سے زیادہ رنگ بیزی بھی اُس کے بیڈھنگے پن کو نہیں چھپا سکے گی۔ ان کو معلوم تھا کہ شعر کے لفظ گلدستے کے پھول ہیں اگر ان کو خوش ذوقی و واقف کاری سے ترتیب نہ دیا جائے تو اس سے پرکیف و رنگین تاثر حاصل نہیں ہو سکتا، اس دیدہ درمی کے تقلد سے ان مصرع سازوں نے نظم میں الفاظ کے نگیںوں سے وہ مینا کاری کی ہے کہ آج بھی فکر و نظر کی مرکب تابشیں ان سے فیض حاصل کرتی ہیں، انھوں نے زبان کے ابتدائی دور میں شاعری کے تاریک راستے پر اسالیب کے ایسے چراغ جلائے ہیں کہ آج فلک پر واز خیالات انھیں روشن میں راستہ طے کرتے ہیں اور ادب کے اولین دور میں نظم کے سادہ اوراق کو طرز ادا کے رنگین نقوش سے اس طرح آراستہ کیا کہ آج انھیں کے نقوش کے چربے اتار کر بڑے بڑے مرقعے تیار کئے جاتے ہیں۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تذکروں کے اثرات ہر دور کی تنقید اور شاعری پر پڑتے رہے ہیں۔ تذکروں کا ہر دور ادب کے مذاق کی تعمیر میں بڑا حصہ ہے، ہم مغرب سے اس قدر واقف ہو جانے اور مغربیت میں اتنے ڈوب جانے کے وجود تذکروں کی ادبی روایات سے اب بھی دامن نہیں بچا سکے ہیں اور نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے قدیم ادب بیش قیمت سرمایہ ہیں ہمیں ان سے ہر دور میں بہت کچھ بصیرت و بصارت حاصل ہوتی رہے گی۔ بڑی خوشی کی بات ہے بیسویں صدی کے ادیبوں نے بھی تذکروں پر بہت کچھ لکھا ہے اور ان سے بہت کچھ کام لیا ہے، اور ان کی اچھی اور صالح روایات کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ ان تذکروں میں ہمیں تنقیدی شعور کے علاوہ اس دور کے یاسی، معاشی، معاشرتی حالات کا ایک ہلکا سا خاکہ بھی نظر آتا ہے، اور شاعروں کی سیرت و شخصیت کے بعض نقوش بھی ملتے ہیں، اُن سے اُن کے مولفین کے علم و فضل کا اندازہ بھی ہوتا ہے، لیکن ان امور پر کچھ لکھنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

م نے اس مضمون میں تذکروں کے اس نقاب پوش تنقیدی شعور کے اثرات کا ذکر کیا ہے جو اشاروں میں بکھر پڑا تھا اور اس سے بعد میں آنے والے ناقدین نے ان چند تنقیدی اشاروں سے داستانیں مرتب کی ہیں اور تذکروں کی روایات کو قائم رکھا ہے اور آگے بڑھا یا ہے۔

نوٹ :- اس مضمون میں میں نے اپنی نوٹ بک سے بھی مدد لی ہے، جن میں میں نے اردو تذکروں اور تذکرہ نگاری پر بھی نوٹ تیار کئے تھے۔ یہاں شاید کہیں خلط مبحث ہو گیا ہو۔

**نیاز نمبر** جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اسکا برادرب نے حصہ لیا ہے اس میں نیاز فتح پوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید اسلوب نگارش، انشا پردازی، مکتوب نگاری دینی رجحانات، صحافی زندگی، شاعری و ادارتی زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایسا مرقع ہے جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز اور اردو صحافت میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صفحات :- ۶۲۴

قیمت ..... آٹھ روپے

نگار پاکستان - ۳۲ - گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳



# اقبال اور ملا

بیاتاکار این امت بسا زیم      قمار زندگی مردانہ بازیم  
چنان نالیم اندر مسجد شہز      کہ دل در سینہ ملا گدازیم

بیامبائی بگرداں ساتگیں را      بیفتاں بر دو گیتی آستیں را  
حقیقت را بہ رندے فاش کردند      کہ ملا کیم شناسد رمیز دین را

دین کافر فکر و تدبیر چہناد  
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

مکتب ملا واسرار کتاب  
کور مادر زاد و نور آفتاب

ملا کو ہے جو بہن میں سجدے کی اجازت  
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا  
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

یا وسعت افلاک میں تکبیر سلسل      یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات  
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست      یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کرنے کا  
حق سے جب حضرت ملا کو بلا حکم بہشت



عرض کی میں نے الہی میری تقصیر معاف  
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت  
نہیں فردوس مقام جدل و قال و اقوال !  
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ترا با خرقة و عتامة کارے      من از خود یا فتم بویے نگارے  
ہمیں یک چوب من سرمایہ من      نہ چوب منبر نے چوب دارے

دل ملا گرفتار غمے نیست      نگاہش بہت در چشمش نے نیست  
ازاں بگر بختیم از مکتب او      کہ در ریگ حجازش زمرے نیست

سیر منبر کلامش نیش دار است      کہ اورا صد کتاب اندر کنار است  
حضور تو من از خجالت نہ گفتیم      ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

نگہبان حرم منما دیر است      یقینش مردہ و چشمش بہ غیر است  
زاندا ز نگاہ او تو ال دید      کہ نو میدانہ ہمہ اسباب خیر است

دین حق از کافری رسوا تر است      زانکہ ملا موہن کافر گر است  
کم نگاہ و کور ذوق دہر زہ گرد      ملت از قال و اقوالش فرد فرد

تری نمازیں باقی جلال ہے نہ جمال  
تری ازاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

الفاظ و معانی میں تفادت نہیں لیکن      ملا کی ازاں اور مجاہد کی ازاں اور  
پرواز ہے دونوں کی الہی ایک فضا میں      کر گس کا جہاں اور ہے شاہی کا جہاں اور

(طلوع اسلام)



# عہدِ حاضر کا ایک مفکر عظیم

سروش

عاقبتِ نزل ما وادی خاموشانست  
حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک اندازہ

حیاتِ انسانی کے غائر مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ انسان کی تمام تاریخ کمزور پر طاقتور کے تسلط کا المیہ ہے۔ دورِ وحشت اور بربریت بنے لیکر موجودہ "تمدن" دوزخ کی تمام تاریخ اسی المیہ کی دردناک تفصیل ہے۔ دورِ وحشت میں اگر جنگل کی معمولی جڑیں پھل، کسی جانور کی کھال اور اسی درجہ دیگر اشیاء نے صرف ایک طاقتور انسان کے لئے کسی کمزور کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا جواز بن سکتی تھیں تو آج اس دور میں جبکہ انسان "فارجی" اعتبار سے تمدن کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہے جلد پٹن کی ہوس میں فضائے عالم جوہری توانائی کی دھمکیوں سے گونج رہی ہے۔

برہمنیت، یہودیت، پاپائیت، شہنشاہیت کے عفریت اپنے ہیبتناک جبر پھاڑے فضائے بسیط پر منڈلاتے رہے اور اپنے خونخوار کمزور انسانوں کے رگ و پے میں پیوست کرتے رہے، اپنی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے رہے۔ کمزور انسان بلبلا تارہا اور جرمِ ضعیفی کی پاتار ہائوں آشامی جاری رہی۔ جہاں کسی صاحبِ دل انسان نے آوازِ حق و انصاف بلند کیا، یہودیت اور شہنشاہیت کے ساتھ رہبانیت اور پاپا کی ساہواز ہو گئی۔ اعلان کر دیا گیا۔ طاقت اور دولت کمزوری اور غربت سب خدا کی طرف سے ہے۔ حق پرست معصوم انسانوں کو قید خانوں میں کیا گیا، ان کی کھالیں کھینچی گئیں، دار پر چڑھائے گئے۔ علانیہ زہر کے پیالے دیئے گئے۔ اور ایسی ہی سیکڑوں قسم کی اذیت ناک صوتوں سے ان کی زندگی ختم کر دی گئیں۔ یا پھر ان کی طبعی موت کے منتظر رہے اور جیسے ہی ان کی آنکھیں بند ہوئیں، ہر ممکن طریقے سے ان کی تعلیمات کو مسخ کرنے، انسان پر ان فوقیت ثابت کرنے نیز مرنے والے کو بشریت سے بالآخر ہستی ثابت کرنے اور اس کی تعلیم کو کسی غیبی طاقت کا متوسل قرار دینے، اس کے حیاتی حق خلط ملط کر کے موموم مابعد الطبیعیاتی نظریات میں تبدیل اور اس کے پیروؤں کے دینی طریقہ ہائے مناسک میں اختلاف میں اختلاف پیدا کر کے ان میں اذیت پیدا کرنے اور اپنے اقتدار کا سکھ جانے کی مذموم کوشش جاری کر دی۔ اس دیدہ دلیری پر جس نے احتجاج کیا اسے کافرِ زندیق، مرتد قرار دیکر ختم کر دیا، تمام سوتے بند کر دیئے جو انسان کو زندگی کے گرے ہوئے نظریہ کی تلقین کرتے ہیں، اس کے برعکس زندگی کے خود ساختہ سکوتی نظریہ کی نشر و اشاعت میں جہزِ ایمان اور راہِ نجات قرار دی گئی۔ گرے ہوئے انسانوں کو اٹھانے کے تمام مشن ناکام کر دیئے گئے سب پر اسرائیلیت کی چھاپ لگا دی، الہام کی اسرائیلی تفسیر نے دنیا کو وہ سنہری فریب دیا کہ رشد و ہدایت چھپتاں ہو گئی اور اس طرح ہر صلح عالی دماغ خادمِ بنی نوع کی صبر آزما کاؤ اندوہناک جانگاہیوں اور خونچکاں جگر گدازیوں کو باز بچہ اطفال بنا دیا گیا۔



زیر پرستی اور اقتدار پسندی کو جو تقویت اسرائیلیت نے پہنچائی اور جو کام اسرائیلی عقائد نے کیا ہے وہ بڑی بڑی ماہر افواج بھی نہ کر سکیں۔  
مصلح کی تعلیمات کو مسخ کر کے جو اکثر سیدھے سادے حیاتیاتی نظریات پیش کرتی رہی ہیں، مابعد الطبیعیاتی نظریات میں تبدیل کر دیا اور اس طرح سب سے  
وہ خطرہ ہی دور کر دیا جو دوسری صورت میں اس کے پیروؤں کی طرف سے زیر پرستی اور اقتدار پسندی کے لئے پیدا ہو سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ اسرائیلیت زیر پرستی  
اور اقتدار پسندی کے لئے کرۂ ارض پر دراز دستی کے علاوہ مواقع فراہم کر کے خود اس کے عوض معاہدے کے اوقات میں محفوظ ٹیکس کر رہی ہے۔ صدیوں نہیں قرون  
سے نسل انسانی کا زمین کو پس پشت ڈال کر کار آسماں کی فکر میں سرگرداں ہے، کہنے والے کہتے رہے۔

تو کارِ زمین را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

لیکن ان کی یہ سب چٹخ چکا ر صدا بصر ثابت ہوئی۔

عام مشاہدے کی بات ہو کہ کرۂ ارض پر انسان کی تمام عمرانی زندگی ایک مسلسل حرکت، انتھک تگ و دو اور ایک لامتناہی جدوجہد کا نتیجہ  
ہے، زمین کا ذرہ ذرہ انسان کی عرق ریزی سے تانباک ہے۔

پھر جس طرح دوسرے ادیان کے صحائف میں تحریف نے گوہر مقصود کو نظر سے اوجھل کر دیا، اسی طرح قرآن حکیم بھی تحریف سے نہ بچ سکا  
اور مفسرین نے قرآن کو پاژند بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ لفظی تحریف تو دنیا کے اس بدترین دین میں ممکن ہی نہیں تھی، لیکن معنوی تحریف سے  
انہیں کوئی نہ روک سکا۔ قرآن حکیم کی تفسیر و تاویل نے اسرائیلیات کا اتنا دافر و ذخیرہ جمع کر دیا کہ اصل مقصد درکنار سرے سے کوئی مقصد ہی نہ رہا  
اور "بِذِ خُكُونٍ فِی دِیْنِ اللّٰهِ اَقْوَا جَا" کی ریت ایسی ختم ہوئی کہ قرآن کے دامن میں پناہ لینے والی مخلوق قرآن سے دور بھاگنے لگی، معنی کی توڑ موڑ سے تمام  
حیاتیاتی نظریات دب کر رہ گئے، ربانیت کی جگہ قنوطیت نے لے لی، جہد البقاء کے علمبردار تبلیجیں سنبھال کر حجر وں اور خانقاہوں میں معتکف ہو گئے۔ اجتہاد  
کے دروازے بند اور تحقیق کے سوتے خشک ہو گئے۔ فسیرونی الارض کے اشہب سر در گھل ہو گئے، فالظہر والے اہل کیف خلقت ژرف بین  
نور بصیرت سے محروم ہو گئے، فتد بدوا کہ بطون فطانت نہ ہو گئے، محمد کی جگہ کامیوں کا خزینہ تاراج ہو گیا۔ اس مایوس کن صورت حال کو رومی کے  
دل سے پوچھئے فرماتے ہیں:۔

من نہ قرآن مغز با برداشتم استخوان پیش سگاں انداختم

اور تمام عمر سر دلبراں بجدیث دیگران میں تمام کر دی۔

اسلام میں اسرائیلیت کا نفوذ اشعریت کے ذریعہ سے ہوا، تمام وہ مسائل جن کے مآخذ اسرائیلی فلسفہ میں پائے جاتے ہیں، اموی دور میں  
اس شدت کے ساتھ اسلامی تعلیمات میں شامل کیئے گئے کہ شخصی انا اور حریت کا خاتمہ ہو گیا۔ ربانیت تصوف کا روپ دھار کر فرقہ باطنیہ کی شکل  
میں نمودار ہوئی اور آج تک زیر پرستی کے رنگ میں موجود ہے، جس کے عقائد کی رد سے رسول کے توسل سے بھی قبل پیر کا توسل "لازمی" ہے۔ زیر پرستی  
نے پہلے فنا فی الشیخ اس کے بعد فنا فی الرسول اور اس کے بعد فنا فی اللہ کا عقیدہ جزو ایمان قرار دیدیا۔ اس آرمیں اسرائیلیت نے جو گلی کھلائے  
میں وہ پاپائیت کے مرغوب "نن ازم" پر ڈھائے گئے مظالم نے کسی طرح کم نہیں۔

ترکی، ایران، ہندوستان، انڈونیشیا، ملائیا سے لے کر مشرق وسطیٰ اسپین افریقہ تک "مسلمین" کے مقبوضہ ممالک یورپ کے یہودیوں کے قبضے  
میں چلے گئے۔ بحجل اللہ جمیعاً اور ولکم الیل مما تصفون کی تہریب سناتا رہا لیکن یہ رہبران ملت شیعہ سنی، مقلد، غیر مقلد، مشافعی، مالکی،  
حنفی، بریلوی، چکرا لوی، دیوبندی، چشتی، قادری، نقشبندی، سہروردی کے جال میں پھنسے رہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بنی امیہ کے دور سے ہی ایک ایسے مکتب فکر کی بنیاد پڑ چکی تھی جو شخص انا و حریت و مساوات کا علمبردار تھا جسکی  
بنیاد ابوذر غفاری نے رکھی تھی اور بنی امیہ کے دور میں ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا، جس کی پاداش میں ان کی تمام زندگی انتہائی پریشانی میں گزری



اور آخری ایام ریگستان میں بے یار و مددگار گزارنا پڑے جہاں اس مرد مجاہد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کے بعد بھی گاہ گاہ ایسے مردان حق پرست اور ارباب بصیرت اٹھتے رہے جو ہر اس نظریہ اور عملیہ کی مخالفت کرتے رہے جو زندگی حیاتیاتی نظریہ کو کسی ایسے فلسفہ میں تبدیل کر دے جس کی نشروانت کا مقصد بعض مخصوص انسانوں کو نفع و ثروت کا مستحق اور اکثر سے نان شبینہ حاصل کرنے کا حق بھی چھین لیتا ہو۔ ایسی ہستیوں میں ابن رشد ابن احماد عربی، شاہ ولی اللہ دہلوی، عبید اللہ سندھی وغیرہ جیسے مفکرین نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

نیاز کشمار بھی اسی مکتب فکر کے سرفروشنوں میں ہوتا ہے۔ اس بے فکر انسان نے جو براہ راست جراحی عمل بلایت یا دوسرے لفظوں میں سترائیل کے ان عقائد پر کیا جو اس گروہ کا خوفناک ترین حربہ ہیں اور جن کے ذریعہ یہ جہہ پوش معصوم انسانوں کو دہشت زدہ کر کے اپنے اقتدار کا سکہ جاتے ہیں اور ساتھ ہی زیر پرست عناصر سے بھی سودے بازی کرتے ہیں، اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ نیاز کا سب سے بڑا کارنامہ ان کاہنوں اور خود ساختہ مولاناؤں کا پندارتو ٹوڑنا ہے۔ نیاز نے بلایت پر وہ کاری ضرب لگائی ہے جو پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانی نے پاپائیت پر لگائی تھی اور یورپ کی آنکھیں کھول دی تھیں جس کے بعد سے آج تک پاپائیت کو یورپ میں وہ فروغ حاصل نہیں ہو سکا جو اس سے قبل تھا۔

نیاز نے ہندوستان میں یہودیت اور اسرائیلیت کے اس قلعہ کو منہدم کیا ہے جس کے گرد اسلام کے نام کی فیصل کھینچی گئی تھی کفر سارے کے کارخانے بند کیے ہیں اور کافر گری کی رسم کہنے کا خاتمہ کیا ہے۔ نیاز وہ عظیم المرتبت شخصیت ہے جس نے اسلام کے لباس میں پوشیدہ اسرائیلیت کو بے نقاب کیا ہے اور یہی مفکر اعظم کا کارنامہ ہے۔

ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما

## تصانیف نیاز فتحپوری

|                            |                     |                         |                   |
|----------------------------|---------------------|-------------------------|-------------------|
| انتقادیات ..               | قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے | جذبات بھاشا ..          | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| مذہب عالم کا تقابلی مطالعہ | ۱۰ روپیہ پچھتر پیسے | ایک شاعر کا انجام ..    | ایک روپیہ         |
| مشکلات غالب ..             | ۲ روپے              | نقاب اٹھ جانے کے بعد .. | پچھتر پیسے        |
| عرص لغت ..                 | ایک روپیہ ۲۵ پیسے   | ”شبستان کا قطرہ“ ..     | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| تاریخ کے گم شدہ اوراق ..   | ۲ روپے              | گوہریں ..               | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن نارکریٹ کراچی ۳



# باب المراسلہ والمناظرہ

(اصلاح معاشرہ)

پروفیسر نظیر صدیقی

مارچ ۱۹۶۷ء کے "نگار پاکستان" میں نیاز صاحب نے میرا جو مضمون شائع کیا تھا اس کی اشاعت نے مجھے ان کا نہ صرف ممنون بنادیا ہے بلکہ ان کی مدیرانہ حیثیت کا پہلے سے زیادہ مداح بھی۔ اس مضمون کے لکھنے میں جس قسم کی جرأت سے میں نے کام لیا تھا اس کا اعتراض انھوں نے بڑی فیاضی کے ساتھ کیا ہے۔ اس مضمون کے شائع کرنے میں جس قسم کی جرأت کا ثبوت انھوں نے دیا اس کے احساس نے میرے دل میں ان کی اس دقت کو بڑھا دیا ہے جو ایک صاحب نظر اور صاحب جرأت ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمیشہ موجود رہی ہے۔ یہ بات محض منی ترا حاجی بگویم تو عرا حاجی بگو کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس بات کے کہلوانے میں میری وہ تمام مایوسیوں کا رفرما ہیں جو فکر و نظر اور جرأت و ہمت کے معاملے میں مجھے ارد گرد کے دوسرے ایڈیٹروں سے ہوتی رہی ہیں۔ ارد گرد سالوں کے مدبروں میں اس دقت نیاز صاحب غالباً واحد شخص ہیں جو اپنی تمام انانیت اور انفرادیت پرستی کے باوجود انسانی و قومی اور بین الاقوامی مسائل سے نہ صرف گہری دل چسپی کا اظہار کرتے رہے ہیں بلکہ گہری دل چسپی کا اظہار کرنے والوں کی ہمت افزائی بھی کرتے رہے ہیں۔

نیاز صاحب کا یہ اندازہ غالباً بالکل صحیح ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ یہی جذبات (جن کا اظہار میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ نظیر صدیقی) بعض دوسرے حضرات کے دلوں میں بھی پائے جاتے ہوں لیکن اسے بے نتیجہ سی بات سمجھ کر وہ خاموش رہتے ہوں"۔ دوسروں کا تذکرہ کر رہی کیا ہے خود میں ان جذبات کو بے نتیجہ سمجھ کر ایک عرصہ تک خاموش رہا ہوں اور آج بھی جبکہ میں نے ملک کے مسائل پر لب کشائی کی جرأت کی ہے اپنے جذبات یا ان کے اظہار کو نتیجہ خیز ماننے کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ پھر بھی کوئی چیز ہے جو اب مجھے خاموش نہیں بیٹھنے دیتی۔ ورنہ حالات حد درجہ مایوس کن ہیں۔

حالات کی اصلاح کے سلسلے میں دو سوال نہایت اہم ہیں (۱) اصلاح کی نوعیت یا صورت کیا ہوگی۔ (۲) اصلاح کے فرائض کون انجام دے گا۔ عملی اور اخلاقی نقطہ نظر سے دوسرا سوال پہلے سے زیادہ دشوار ہے فرض کر لیجئے کہ ہمارا پورا معاشرہ یا معاشرے کا بڑا حصہ چند اصلاحی تدبیروں پر متفق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے ملک یا معاشرے میں اصلاح کی مشینری کون چلائے گا جہاں ہر فرد اصلاح کا محتاج



یا اصلاحی سزائوں کا مستحق ہے۔

نیا ز صاحب فرماتے ہیں کہ "جب کسی قوم کی اخلاقی پستی دور ہو جائے گی، تو لازماً اعمال حکومت کے اخلاق بھی بلند ہو جائیں گے اور عوام کی ذہنیت بھی اس سطح پر آجائے گی کہ تعزیری سخت گیری کا سوال ہی سامنے نہ آنے پائے" مجھے نیا ز صاحب کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے۔ لیکن اصل سوال جہاں کا تھاں رہ جاتا ہے کہ آخر قوم کی اخلاقی پستی دور ہوگی تو کیونکر۔ نیا ز صاحب اس بنیادی سوال کا جواب دینے کی بجائے ان سوالوں سے الجھ پڑتے ہیں کہ اخلاق سے کیا مراد ہے اور اس کی صحت و بلندی کا صحیح معیار کیا ہو سکتا ہے۔ ویسے اس سلسلے میں جو باتیں انھوں نے کہی ہیں ان سے مجھی مجھے کوئی اختلاف نہیں۔ اگر مجھے پاکستانیوں کے اخلاق و کردار سے شکایت ہے تو یہ شکایت وہ نہیں ہے جو کسی مولوی یا ملا کو عام مسلمانوں سے رہا کرتی ہے۔ یہ بات واقعی سمجھ لینے کی ہے کہ جب ہم پاکستانی اخلاق و کردار کی پستی کا ردناہ دیتے ہیں تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں اور پاکستانی اخلاق و کردار کی اصلاح کا مفہوم کیا ہونا چاہئے۔ پاکستان میں ایسے افراد اور اداروں کی کمی نہیں جن کے نزدیک پاکستانیوں کی سب سے بڑی کمزوری اور خرابی یہ ہے کہ ان کی اکثریت نماز نہیں پڑھتی۔ ایسے افراد اور ادارے نماز نہ پڑھنے کو تمام خطابیوں کا سرچشمہ اور نماز پڑھنے کو تمام برائیوں کا سدباب تصور کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں اور اداروں کے ذہن میں پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ پاکستان میں نماز قانوناً فرض قرار دی جائے۔ اگر آپ پاکستانی اخبارات باقاعدگی سے پڑھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بعض لوگ اور بعض ادارے صدر ایوب تک سے درخواست کرتے رہتے ہیں کہ وہ نماز کو ایک قانونی فرض قرار دے دیں۔ لاہور میں ایک ڈپٹی کمشنر صاحب کی صدارت میں یہاں تک فیصلہ ہو گیا کہ بار بار کی تلقین کے باوجود نماز نہ پڑھنے والوں کا دفعہ ۱۰۰ کے تحت چالان کر کے انھیں ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں مزید کارروائی کے لئے پیش کیا جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے اس جلسے کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ آج مسلمان جن مسائل سے دوچار ہیں وہ سب ان کی اخلاقی گراؤٹ کی پیداوار ہیں اور ان اخلاقی گراؤٹوں کا حل نماز ہے۔ لیکن نماز کو ہر مرض کا علاج بتانے والے اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ جب تک نماز کے اخلاقی تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے نماز پڑھنے سے کیا حاصل۔ پچھلے دنوں پاکستانی اخباروں میں ڈھاکا یونیورسٹی کے ایک سابق امریکی پروفیسر ڈاکٹر جون ادون کے اس مضمون پر بڑا شور مچا ہوا جو موصوف نے امریکا واپس جا کر وہاں کے کسی اخبار میں چھپوا یا تھا۔ پاکستانی اخباروں نے جہاں زور و شور کے ساتھ ان کے غلط بیانات کی تردید کی وہاں ان کے صحیح بیانات کی صحت کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ مثلاً انھوں نے لکھا تھا کہ پاکستان میں اسلام پر جس طرح عمل ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں کوئی ایسا اخلاقی ضابطہ نہیں ہے جو پاکستانیوں کی روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہو۔ اسلام کا زور ظاہری پابندیوں پر ہے۔ پانچ وقت کی نماز، رمضان میں روزے رکھنا اور کبھی کبھار خیرات دینا۔ اسلام نے باہمی تعاون کے رویے کو کوئی فردغ نہیں دیا، اسلامیات کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ اسلام کے بارے میں ڈاکٹر ادون کے مندرجہ بالا فرمودات یکسر غلط ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اسلام پر پاکستان میں جس طرح عمل ہو رہا ہے اس سے وہی کچھ ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے بیان کیا۔ ہمارے یہاں نماز اس لئے پڑھی جاتی ہے کہ ثواب حاصل ہو گا روزے اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ عاقبت بخیر ہوگی۔ وحی ہذا القیاس۔ مذہبی احکام کے پردے میں جو اخلاقی اور سماجی فوائد رکھے گئے ہیں ان پر نہ تو ارباب مذہب کی



نظر ہے تو وہ ان فوائد کے حصول کو سماجی زندگی کی تنظیم و تہذیب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی تجربہ کرنے کے لئے تیار نہیں کہ نماز نہ پڑھنے کے نفسیاتی، تہذیبی اور سائنسی اسباب کیا ہیں۔ موجودہ ضروریات کے اعتبار سے انسان کی نجات صرف فلاحی ریاست پر منحصر ہے۔ فلاحی ریاست سے میری مراد ایسی ریاست ہے جہاں تمام انسانوں کو زیادہ سے زیادہ عافیت اور مسرت نصیب ہو۔ جہاں ترقی کے معنی صرف مادی ترقی کے نہ ہوں بلکہ اخلاقی اقدار کی ترویج اس کا مقصد عظیم ہو۔ میرا خیال ہے کہ جب تک اخلاقی اقدار کو اخروی صلہ یا جزا کے تصورات سے الگ نہ کیا جائے گا۔ سماج میں ان اقدار کا استحکام یا ان پر عمل درآمد ممکن نہیں۔ پاکستان میں جو لوگ اسلامی نظام کے قیام پر مصر ہیں اور جو اسلامی نظام کو جمہوریت کے منافی نہیں سمجھتے انھیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے کہ ان دونوں کے اجتماع کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔

مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ میں اصل موضوع سے بھٹک گیا ہوں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر مجھے پاکستانیوں کے اخلاق و کردار سے شکایت ہے تو یہ شکایت وہ نہیں ہے جو کسی مولوی یا ملا کو عام مسلمانوں سے رہا کرتی ہے۔ کیوں کہ میرے نزدیک آگے بڑھنے کے معنی پیچھے جانے کے نہیں۔ اخلاق و کردار کی اصلاح سے میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ باشندگان پاکستان فرشتے بن جائیں یا عابد شرب زندہ دار۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ لوگوں کے اخلاق و کردار کم از کم اس حد تک پاکیزہ اور بلند ہوں کہ اجتماعی زندگی ہموار اور خوشگوار بن جائے۔

ایک صاف ستھرے آرام دہ معاشرہ کے قیام میں دو تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ غربت کا خاتمہ معقول نظام تعلیم۔ اور قانون کی حکمرانی۔ غربت سماجی، اخلاقی اور سیاسی برائیوں کا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ جب تک دونوں حیثیتوں سے اس کا خاتمہ نہ ہوگا تعلیم، قانون، مذہب اور روایات کی ساری برکتیں بیکار ثابت ہوتی رہیں گی۔

معقول نظام تعلیم کی تشریح میں پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یہ مسئلہ اتنا وسیع اور پیچیدہ ہے کہ ہر ترقی یافتہ قوم کے مفکرین کے خصوصی مطالعے کا موضوع رہا ہے۔ ایوب حکومت نے اس مسئلے پر اتنا احسان ضرور کیا کہ ایک کمیشن مقرر کر کے ایجوکیشن کمیشن رپورٹ تیار کرائی اور اب اس پر کسی حد تک عمل بھی ہو رہا ہے۔ تاہم پاکستان میں تعلیمی کارڈ بار جس پنج پر چل رہا ہے اس سے اچھے شہریوں کے پیدا ہونے کی توقع مشکل سے کی جاسکتی ہے۔ اچھے طلبہ اچھے اساتذہ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے اور اچھے اساتذہ کا مسئلہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر ابھی تک سرے سے غور ہی نہیں کیا گیا۔

پاکستان میں جہاں تک قانون کی حکمرانی کا تعلق ہے، اس کا ذکر اپنے پچھلے مضمون میں کر چکا ہوں اور پھر اس کا اعادہ کرنا ہونا اگر کوئی چیز کسی حد تک سماجی برائیوں کی رد کو تھام کر سکتی ہے تو وہ قانون کی حکمرانی ہے۔ نیاز صاحب کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ سخت ترین تعزیری قوانین بھی جرائم کا خاتمہ نہ کر سکے لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اگر دنیا میں تعزیری قوانین نہ ہوتے تو جرائم کی تعداد کیلے ہوتی۔ تعزیری قوانین کبھی کسی جرم کا مکمل خاتمہ نہیں کر سکتے لیکن وہ جس قدر سخت ہوں گے ان کا دائرہ اثر اتنا ہی وسیع ہوگا۔

میں نے اپنے سابقہ مضمون میں پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے بعض نو ترقی یافتہ ممالک کی حیرت انگیز اقتصاد



سماجی اور سیاسی ترقی کی تعریف کی تھی۔ نیاز صاحب نے میری توجہ ان ممالک کی نفسیاتی نا آسودگیوں اور اخلاقی بدعنوانیوں کی طرف دلائی ہے جو پہلے بھی میری نظر سے پوشیدہ نہ تھیں۔ اس باب میں مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ اگر انسان ہمیشہ نا آسودہ رہا۔ ہے اور نا آسودہ رہے گا، اگر وہ ہمیشہ درندہ رہا ہے اور ہمیشہ درندہ رہے گا۔ جب بھی خوش حالی سے پیدا ہونے والی نا آسودگی زبوں حالی کی نا آسودگی سے بہتر ہے اور انسان کا جزوی طور پر مہذب ہو جانا کلی طور پر وحشی رہنے سے یقیناً بہتر ہے۔ جب میں یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان ترقی یافتہ ممالک کی تقلید کرے تو میری اس خواہش کا مفہوم صرف اتنا ہوتا ہے کہ پاکستان ان ممالک کی خوبیوں کو اپنالے ہماری قومی برصیبی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم ترقی یافتہ ممالک کی حقیقت پسندی، اصول پرستی، علم دوستی اور حب الوطنی کی بجائے ٹیڈی ازم پر فدا ہو کر رہ گئے۔ ع فکر ہر کس بقدر ہمت اور ست۔

(نگار) فاضل مقالہ نگار نے جس درد دُکھ کے ساتھ اپنے خیالات قلمبند کئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کی خوشحالی اور مادی و ذہنی ترقی کے بڑے آرزو مند ہیں اور اس سلسلہ میں جو تجزیہ ہمارے معاشرہ اور ذہنی میلانات کا کیا ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ لیکن اصل سوال تدبیر و اصلاح کا ہے۔ یعنی یہ کہ ملک کی زبوں حالی اور افراد قوم کی اخلاقی پستی کو کیونکر دور کیا جاسکتا ہے اور یہ مسئلہ اس میں شک نہیں بڑا پیچیدہ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں۔ ان تمام خرابیوں کا صحیح علاج صرف صحیح تعلیم ہے اس میں شک نہیں کہ مذہب کا جو مفہوم اس وقت پیش کیا جاتا ہے وہ یقیناً خارج ترقی ہے کیونکہ اس کا تعلق محض مخصوص عقاید و مراسم سے ہے۔ ذہنی بیداری و عملی احساس و اضطراب سے نہیں۔ لیکن اس جمود کا ازالہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مذہب اسلام کی صحیح غایت اور اس کے حقیقی مقصود کو سمجھ کر دینے والے اداروں کا استیصال نہ ہو جائے اور یہ حجت و مناظرہ سے ممکن نہیں بلکہ اس کا ذریعہ صرف صحیح بنیادی تعلیم ہے جو دیر طلب بات ضرور ہے۔ کیونکہ یہ ادارے حکومت اسلام کا اقتدار ختم ہونے کے بعد ہی *Poor man's consolation* کی حیثیت سے تمام ممالک اسلامی میں رونما ہو گئے تھے تاکہ اپنی بد حالی سے پیدا ہونے والی مایوسیوں کو برکاتِ اخروی کے دلخوش کن توقعات سے دور کر سکیں۔ گویا یہ ایک نوع کا خاموش احتجاج یا غریبانہ انتقام تھا جو وہ غالب قوموں سے لینا چاہتے تھے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ وہ اپنی زندگی کی دشواریاں جھیل جانے کی راہیں اس طرح پیدا کر رہے تھے

پھر غور کیجئے کہ یہ تحریک بے عملی کب شروع ہوئی۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے اور اس کا آغاز دراصل اسی وقت ہو گیا تھا جب اول اول مختلف مسلم حکومتیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں اور مغلوب اقوام کی بعض جماعتوں نے (جنہیں صوفیہ کہتے ہیں) اپنے آپ کو تسلی پہنچانے کے لئے قناعت و توکل، مشیت و مقدر، ضالہ و غیرہ کی مختلف اصطلاحیں وضع کیں اور پھر رفتہ رفتہ فلسفہ کارنگ پیدا کر کے *Pan Theism* یا عقیدہ وحدت الوجود میں تبدیل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں یہ عقیدہ پیدا ہو جائے گا کہ انسان بہر حال مجبور ہے اور بد بختی و نکتہ، ذلت و افلاس بھی سب خدا ہی کا عطیہ ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ قوم اپنی قوت عمل کھو بیٹھے اور معتقدات پر بھروسہ کر کے شعار مذہبی کے حقیقی مقصود کو بھی بل دے۔ یہی وہ ذہنیت تھی جس نے نماز، زکوٰۃ، حج و زکوٰۃ تمام شعارِ اسلامی کی صحیح روح کو نظر انداز کر کے صرف ظاہری اعمال کو اصل مذہب قرار دے دیا اور اسی کی تلقین عام ہو گئی۔ بنا براں مسلمانوں کی ترقی کے



سلسلہ میں سب سے پہلے یہی سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ اس بے عملی کی خواب آور ذہنیت کو جو صدیوں سے ہمارا مذہبی شعار بنی ہوئی ہے۔ کیونکر دور کیا جائے۔ اس کی تدبیر جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا یہ نہیں کہ ان جماعتوں کو سمجھا بجھا کر یہ راہ پر لایا جائے کیونکہ ان کا یہ مرض قطعاً لا علاج ہو چکا ہے۔ اور اب اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں کہ قوم کی تہی نسل کو اس سے متاثر نہ ہونے دیا جائے۔ یعنی شروع ہی سے ان کی تعلیم اس پہنچ پر ہونا چاہئے کہ مذہب کا مردوجہ غلط مفہوم ان کے سامنے نہ آئے اور اسلام میں جو خرافاتی لٹریچر شامل ہو گیا ہے۔ اس سے انھیں بالکل دور رکھا جائے۔ پھر اس کے لئے صرف نصاب ہی کا بدل دینا کافی نہ ہو گا بلکہ اساتذہ بھی خاص ذہنیت کے پیدا کرنے ہوں گے اور یہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ یقیناً بڑی دیر طلب بات ہے لیکن اگر اس طرح ہم صحیح معنی میں مسلم قوم کو دوبارہ زندہ کر سکے تو اس کے لئے نصف صدی کا انتظار بھی ہم کو گوارا ہے۔ مگر یہ وہ بات ہے جو ہمارے آپ کے نہیں بلکہ حکومت کے سوچنے کی ہے۔

اب ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام سو اس کی اصلاح بھی اسی وقت ممکن ہے جب قوم کے افراد کا کردار بلند ہو۔ اجتماعی ترقی کے خیال پر ان کے اخلاق کی بنیاد قائم ہو اور تمام نظام معاشرہ ایک ہی مقصود و غایت سے وابستہ ہو۔ سو اس کا انحصار بھی صحیح تعلیم و تربیت پر ہے۔

اس سلسلے میں یہ امر یقیناً غور طلب ہے کہ آیا قانون اس باب میں ہماری کوئی مدد کر سکتا ہے یا نہیں۔ یہ ایک حد تک درست ہے کہ جبر و سیاست سے بھی قوم کی ذہنیت کو بدلا جاسکتا ہے، جیسا کہ روس و چین میں کیا گیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہنوز تجرباتی دور کی چیز ہے اور ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تجربہ ضرور کامیاب ہو گا۔ چنانچہ روس کو دیکھئے کہ اس کی اشتراکیت کس طرح آہستہ آہستہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت چین کو بھی اپنے موجودہ موقف کو بدلتا پڑے۔

حکومتیں آئین کو بیشک بدل سکتی ہیں، تعزیر و سیاست سے جرائم میں بھی کمی ہو سکتی ہے لیکن اصل چیز قوم کی ذہنیت کا بدلنا ہے اور یہ صرف صحیح تعلیم و تربیت ہی سے ممکن ہے۔

## جناب حیرت شملوی (کلفٹن کراچی) ۶۴ ”نگار“ اپریل کا باب المراسلہ دیکھ کر

محرمی و محترمی، السلام علیکم،

میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ عریضہ چھپے، مگر چھپ گیا، اور اس کے بعد کہ وہ چھپ گیا،

میں نہیں چاہتا کہ بات آگے بڑھے، اور فتنہ بن جائے، اس لئے

یہ کہہ کر کہ لکھ دینکے ولی دین“ اور فرزتکم اعلیٰ بمن ہوا ہڈی بھینکا۔

اپنی طرف سے اسے یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میں دین میں اسرائیلیات یہ الفاظ دیگر مولود خوانی

ہفتوات کا ہرگز قائل نہیں ہوں، دل میں بجز اللہ بڑی وسعت رکھتا ہوں، کسی سے اختلاف

بھی رکھتا ہوں، تو اس کے خلاف کوئی کاوش کوئی کہ ورت نہیں رکھتا، کسی کی بے راہ



روی پر کڑھتا ہوں، خوش نہیں ہوتا، یہاں بھی خلوص کا جواب خلوص ہے اور دلیل کا جواب  
دلیل، لیکن اگر کسی کی دلیل متحر و تذلیل ہو تو دیکھ جاتا ہے،  
اسلام کے شعوری طور پر قائل حضور بھی ہیں اور یہ خاکسار بھی، لیکن فرق یہ ہے کہ آپ  
کے یہاں دین بے قید ہے اور یہاں "پابند"

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھتا ہے  
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

جناب نے میری اس سادہ سی گزارش سے تعرض نہیں فرمایا کہ "نگار" میں دینی مسائل  
پر گفتگو نہ ہو، آپ کے جواب سے میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے آپ کو مجھ پر ترس نہیں غصہ  
آگیا، اور اسی غصے میں آپ نے اپنے متعلق وہ الفاظ تک لکھ ڈالے جن کا میں تصور بھی  
نہ کر سکتا تھا، آپ نے نظریاتی اختلاف ایک الگ چیز ہے مگر میری نظریں آپ برابر عزیز و  
محترم ہی رہے، اور رہیں گے، احقر کے نزدیک

جنون و فاسق چاہیے،  
ذرا دیر کا درد سر کچھ نہیں

بہر حال اگر آپ کو میرے عریضے سے کسی وجہ سے بھی کوئی اذیت پہنچی ہے تو آپ اُسے اللہ و فی سبیل اللہ  
معاف فرمادیں، حیرت اور بزرگوں کی شان میں گستاخی، یا ان کی دل آزاری؟ — لاجول ولا قوۃ —  
سلامت ہوش کے ساتھ ناممکن،

صاحب "طلوع اسلام" سے تعلق خاطر حسب سابق آج بھی ہے، باقی یہ کہ

اک بات ہے کہ جس سے مجھے اختلاف ہے  
کچھ ان کی ذات سے تو عداوت نہیں مجھے

"طلوع اسلام" کے باب میں احقر کا ایک تاثر یہ ہے کہ ان کے نزدیک دینی شعائر بہ ظاہر ایک بوجھ ہیں سر  
آنتار پھینکنے کے قابل، لیکن غنیمت ہے کہ وہاں آخرت کا تصور ہے، آپ کے یہاں تو یہ بھی نہیں — دین کا  
ذکر کیا، یاں سر ہی فائب ہے گریباں سے،

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے مذہب و مسلک سے اپنی برأت فرمادی تھی، لیکن باپ کے  
باپ ہونے سے انکار نہیں تھا، اپنے آزری یا نیم آزری بزرگوں کے ساتھ حیرت کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے  
اُس کی ذہنی تہذیب و تربیت میں ان بزرگوں کا بھی بڑا حصہ ہے اور حیرت کو ان کا یہ احسان تسلیم،  
مقامات آہ و نفاں سے میری مراد صرف یہ تھی کہ دین پر نقد و جرح کے لئے دوسرے برس الے اور  
اجارات بھی ہیں، مثلاً "طلوع اسلام" اور "جنگ" و "انجام"

ممنون ہو نگا اگر آپ "نگار" کی آئندہ اشاعت میں عریضہ بھی شائع فرمادیں۔



(نگار) تعمیل ارشاد آپ کا خط شائع کر رہا ہوں، گو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ یقین کیجئے کہ مجھے آپ کی سابق تحریر مطلق ناگوار نہیں ہوئی بلکہ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں اسے آپ (باخاطر ناشاد ہی ہوں) دیکھتے ہوئے ہیں۔

مذاہب عالم کے باب میں جو ذہنی انتشار اس وقت پایا جاتا ہے اس کا دور ہونا ممکن نہیں۔ اسے تو ذہنی ترقیوں کے ساتھ بڑھتا ہے اور وہ اسی طرح برابر بڑھتا رہے گا۔ لیکن یہ سن کر غالباً آپ کو حیرت ہوگی کہ خدا کو صحیح معنی میں خدا سمجھنے کا زمانہ ابھی آیا ہے اور وہ "الحاد و انکار" جس کو دور کرنے کے لئے ہم نے ابڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور کامیاب نہ ہوئے۔ اب مفقود ہوتا جا رہا ہے اور بالکل پہلی مرتبہ خدا کو بے نقاب دیکھنے کی راہیں پیدا ہو رہی ہیں۔

دیکھئے میرے آپ کے نقطہ نظر میں کتنا اختلاف ہے، آپ فرماتے ہیں کہ دنیا متحد ہوتی جا رہی ہے اور میں کہتا ہوں کہ خدا کا بالکل صحیح تشریحی تصور اب اور زیادہ روشن ہوتا جا رہا ہے۔

اس موضوع پر تو کھل کر میں آئندہ کسی وقت گفتگو کر دینگا، لیکن فی الحال اس قدر کہنے کی اجازت ضرور دیجئے کہ اگر آپ مجھے ملحد یا منکر خدا سمجھتے ہیں تو آپ مجھ پر نہیں بلکہ خدا پر ظلم کرتے ہیں کیونکہ میں اور وہ کی طرح خدا کو ناقابل فہم سمجھ کر اس کا اقرار نہیں کرتا ہوں جو دراصل انکار کے برابر ہے۔ بلکہ میں سمجھ کر ان کے وجود کے مذہبی تصور سے انکار کرتا ہوں جو عین اقرار ہے۔ رہا سوال معتقات مروجہ کا سو یہ سب فردی باتیں ہیں اصل فریب ان کا کوئی تعلق نہیں اس لئے آپ کیوں ان سے گرا بنا رہے ہیں اور اگر کوئی شخص ان کی باتوں میں آپ کا ہم آہنگ نہ ہو تو آپ کو کیوں ناگوار ہو۔ آپ تو صوفی مشرب انسان ہیں اور صوفیہ کو تو لانا میں بھی جلوۃ الہ نظر آتا ہے۔

## اہم سرکاری مطبوعات

- ۱۔ دستور جمہوریہ پاکستان ۱۹۶۲ء (ایم۔ لا۔ ۱۳۹) ۸۷ پیسے
- ۲۔ پاکستان کے موجودہ اور پیشینہ کے درخواست گزاروں کے لئے گائیڈ ۱۹۶۳ء (سی پی ڈی۔ ۵) ۵۶ پیسے
- ۳۔ ٹیکس کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ جلد (۲) ۱۹۶۲ء (ٹی ای سی۔ ۲) ۱۵ روپے ۸۷ پیسے
- ۴۔ پاکستان کا اقتصادی جائزہ ۱۹۶۲-۶۳ء (ایف ڈی۔ ۶۵) ۵ روپے
- ۵۔ کتابوں اور مطبوعات برائے ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء کے پبلیشنگ آفس کنٹرول لائبریری پبلیشر کیٹیلاگ (سی پی ڈی۔ ۷) ۲ روپے ۵۰ پیسے
- ۶۔ دیسی پھلوں کے محفوظ رکھنے کے فنی طریقوں اور انڈسٹری کی حفاظت کی برقراری کے متعلق رپورٹ ۱۹۶۳ء (پی ٹی سی۔ ۶۲) ۲ روپے
- ۷۔ پاکستان کے طبقات الارض سروے کا ریکارڈ جلد (۱۰) حصہ (۲) الف (جی ایس پی۔ ۱۵۰) ۱ روپے ۵۶ پیسے
- ۸۔ حکومت پاکستان کے برسر خدمت افسران درجہ اول کی سول لسٹ ۱۹۶۳ء (ای ایس ٹی ڈیزین۔ ۳) ۸ روپے ۳۷ پیسے
- ۹۔ پاکستان میں نافذ قواعد طیران برائے ہوا بازان اور دیگر ملازمین (ڈی۔ سی۔ اے۔ ۱۲) ۶ روپے ۶۲ پیسے

ان جگہوں سے حاصل کیجئے :-

- ۱۔ مینجر آف پبلیکیشن، حکومت پاکستان۔ بلاک نمبر ۲۴۔ شاہراہ عراق۔ کراچی
- ۲۔ مغربی پاکستان کے تمام مقررہ ایجنٹ



# باب الاستفسار

## حافظ کے دو شعر

(سید عبدالکریم صاحب خاندیس)

حافظ کے مندرجہ ذیل دو اشعار کا کیا مطلب ہے ؟

- ۱۔ حق ست ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست  
تا آب با کہ منبعش اللہ اکبر ست
- ۲۔ کاشش حافظ پیرا مرد کنگر بودے  
تا زوینار و درم سے کیا بودے

اگر اللہ اکبر سے کلمہ توحید مراد ہے تو اس کا منبع سے کیا تعلق ہے اور آب خضر و ظلمات سے اس کا  
تقابل کیا مفہوم رکھتا ہے۔  
دوسرے شعر میں کنگر سے کیا مراد ہے اور دینار و درم سے کیا واسطہ۔

(نگار) اللہ اکبر نام ہے ایک درہ کا شیراز کے قریب۔ مفہوم یہ ہے کہ خضر جس چشمہ کی تلاش میں ظلمات گئے تھے اس سے ہمارے  
درہ۔ اللہ اکبر کے چشمہ کا پانی بدرجہا بہتر ہے۔

کنگر۔ فقیروں کی ایک جماعت کا نام ہے جو کسی وقت ایران میں پانی جاتی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں بکری کا سینک ہوتا تھا  
اور دوسرے ہاتھ میں بکری کے شانے کی ہڈی۔ یہ گھر گھر پھرتے تھے اور سینک کو ہڈی پر رگڑ کر بڑی بھیاناک آواز پیدا کرتے تاکہ  
صاحب خانہ یا صاحب دکان متوجہ ہو جائے اور اسے کچھ دیدے۔ لیکن اگر کوئی ان کے سوال کو رد کر دیتا تھا تو ان کے ساتھ  
کا کوئی کس لڑکا چاقو سے اپنا جسم زخمی کر لیتا اور جب لوگ اس کے جسم سے خون بہتا ہوا دیکھتے تو ازراہِ ترحم یا کراہت کچھ نہ بولتے  
اسے دے کر اس منظر سے نجات حاصل کر لیتے۔

حافظ کے اس شعر میں اسی جماعت کی طرف اشارہ ہے اور کہتا ہے کہ کاش حافظ کسی کنگر کا لڑکا ہی ہوتا تاکہ اس کی جیب  
تو دینار و درم سے بھری رہتی۔ کسی وقت ہندوستان میں بھی اس مشرب کے فقیر بہ کثرت نظر آتے تھے، جنہیں  
مڑچرا کہتے تھے اور وہ بھی چھریوں سے اپنے آپ کو زخمی کر کے دوکانداروں سے خاصی رقم وصول کر لیتے تھے۔  
فارسی میں کنگر اور کنگرہ اونچی چھت یا بلند عمارت کو بھی کہتے ہیں۔ یہی لفظ اردو میں کنگورہ ہو گیا جسے گئی بھی  
ہے یعنی چھوٹے چھوٹے گنبد یا محراب دار طاقے جو قلعہ یا گھر پناہ کی دیوار میں لجا بجا بنائے جاتے ہیں۔



# منظومات

## گردش

فضا ابن فیضی

سکن بوجہل و آذر ہے " رسولوں کی " جناب  
 ہے کتاب و علم " کی تقدیر میں " دار و صلیب "  
 ہے لباسوں کا چم و خم " ہی شرافت کا عیار  
 گندگی، " زریں قبا " پاکیزگی " صد جامہ چاک  
 بابہ زنجیر اگہی " صید جنوں " ہوش و خرد "  
 غونچکوں، شعر و ادب کی حرمتیں " فن کا وقار "  
 جہل کے پتلے ہیں اب دانائے اسرار و علوم "  
 غوں کے آنسو رو رہا ہے " آدمیت کا مال "  
 اسیر من " کے جسم پر ہے " خرقہ یعقوب و نوح "  
 ہے یزید و ول کی جبیں کا قشقہ " ناموس حسین "

خلوک جبریل و ہذاں میں ہے " شیطان باریاب  
 سرخروئی ہے فقط " خبث و بہالت " کونہیب  
 دیکھتا ہے کون قلب و روح کے آئینہ زار  
 رات کے دامن میں تارے صبح کی مٹھی میں خاک  
 مانگتے ہیں صبح کے خالق اندھیروں سے مدد  
 اڑ رہا ہے راستوں میں " دانش و دیں " کا غبار  
 ہے سفیر مملکت صحن چین میں اسب سموم  
 " مکتبوں " سے پڑھ کے باہر آئے " روباہ و شغال "  
 " قہجی کی قید میں ہے " مریم و سیتا کی روح  
 ہے طربخانہ میں برپا کر بلا کا شور و شین،



گھوٹی ہے کینہ تو زلی، شہد کے ساغریں سسم  
 ہیں کفن کے چوراب "پروردگار تاج و تخت"  
 ہیں بخیل و سفلہ پرور، منعموں کے اب مشیر  
 ہیں خرف ریزے، انگوٹھی میں جرے ہیرے کانگ  
 "جیب کترے" بن کے اترائے اس قوموں کے امام  
 گلشنوں کی پاسباں ہے "صرصر شعرا بہ کف"  
 خال و خط میں حسن، جرم و جہل سے ابیز دل  
 تلخیوں کے دیوتا ہیں "دارت قند و گلاب"  
 سیل و طوفاں کے ہیں بندے، کشتیوں کے ناخدا  
 سر بزاوا من عالم، شورشیں چوبند و چاق،  
 ہیں لیٹرے پاسباں، "قزاق" ہیں "عالم پناہ"  
 جبر کے پنچوں میں ہے نازک کلائی دقت کی  
 صلح کے ہیر و ہیں شامل، جنگ کی تشکیل میں  
 "یہ مکان جہل و فتنہ" یہ جہاں ضرب و حرب  
 خون سے تر ہے "تمدن" کی سنہری آستین

پو جتی ہے خود سری کذب و رعونت کے صنم  
 چاند سورج کے ہیں مالک "زنگیاں تیرہ بخت"  
 ملک کے ناموس کے گاہک ہیں خود شاہ و وزیر  
 پوستیں پہنے ہوئے پھرتے ہیں بازار و نمیں سبگ  
 ہاتھ میں نالی کے کٹر فون کے ہیں اب "سوئے کے جام"  
 "عصمتوں کے راہزن" ہیں "والی بیت الشرف"  
 ہیں اندھیرے جگمگاتی روشنی کے متصل  
 چہچہے طوفاں ہیں کتنے ساحلوں کے ہمرکاب  
 وقت کے سلطان بن کر نکلتے ہیں "خواجہ سرا"  
 "بسملوں" کا "خجرو شمیر" اڑاتے ہیں مذاق  
 "بھیڑے" پہنے ہوئے بیٹھے ہیں "سوئے کی کلاہ"  
 جل رہی ہے آگ میں "انسانیت" کی جل پری  
 تیرتی ہیں یہ "بطیں" اپنے "لہو کی جھیل" میں  
 ہو گئے کتنے لہو تلوار کے دامن میں جذب  
 دیکھوں کن آنکھوں سے یہ جشنِ تباہی ہم نشین

رک گیا ہے پھر سوانیرے پہ آکر ہفتاب  
 کوئی گردش اے فلک اکروٹ کوئی اے انقلاب



# طالب جے پوری

وہ روز و شب ، وہ مہ و آفتاب پیدا کر  
 شرار عشق سے وہ آفتاب پیدا کر  
 نہ دل ہی ہمارا ، نہ تم ہی ہمارے  
 محبت میں ایسے بھی کچھ دن گزارے  
 اک کیف تھا کہ روح پہ برسا کے رہ گئے  
 کچھ چشم التفات سے گھبرا کے رہ گئے  
 کچھ دور وہ بھی ساتھ مرے آگے رہ گئے  
 ملتے ہی آنکھ آج وہ شرما کے رہ گئے  
 دامن جو تیرے سامنے پھیلا کے رہ گئے

جو اس آئیں ہم ایسے سیاہ بختوں کو  
 بدوس نہ ہر کو بختے جو آب و تاب حیات  
 یہ جینا بھی ہے کوئی جینے میں جینا  
 نہ آنکھوں میں آنسو ، نہ لب پر تبسم  
 زہیر لب وہ آج جو فرما کے رہ گئے  
 کچھ شکوہ سنج تلخی جو ردِ دستم رہے  
 طے کر چکے تھے دائرہ دوس کی جو منزلیں  
 اپنی نگاہ شوق سے نادم ہوں کس قدر  
 ان پر بھی اک نگاہ کرم اے گدا نوازا

## شارق - میرٹھی

دل کشتی کا موسم ہے ، دل کشتی نہیں ملتی  
 دور دور منزل کی روشنی نہیں ملتی  
 غمزدوں کے ہونٹوں پر کیوں منہ نہیں ملتی  
 جیسے ان چراغوں سے روشنی نہیں ملتی  
 دوستی کے پردے میں دشمنی نہیں ملتی

گل ہوں یا شگوفے ہوں تازگی نہیں ملتی  
 جانے کن اندھیروں میں اہل کاروں گم ہیں  
 بے وفا زمانہ میں کون اس کو سمجھے گا  
 آج یوں گریزاں ہیں ہم خلوص و الفت سے  
 میکدہ کی دنیا ہے وہ جگہ جہاں شارق

(۲)

تیرے غم کی خوشی کم نہ ہوگی  
 میرا غم خانہ کرنے سے روشن  
 پھول مر جھائیں گے اور کھلیں گے  
 حرفِ آنسو بہانے سے ہمد  
 یہ مسرت کبھی کم نہ ہوگی  
 چاند کی چاندنی کم نہ ہوگی  
 باغ کی دل کشتی کم نہ ہوگی  
 رات کی تیرگی کم نہ ہوگی

آشیانہ جلا کر بھی شارق  
 برق کی بجائے بھی کم نہ ہوگی



انعامات حاصل کرنے کے لئے

چار نئی سہولتیں

تمام منظور شدہ بینکوں اور ممبرانہ اور  
سب پرستہ آفسوں سے انعامات کی درخواست  
خسر طے اور کیش کرنے جاسکتے ہیں۔

کیش شدہ بونڈ دوبارہ فروخت  
کئے جاتے ہیں تاکہ انعامات  
بغیر تقسیم ہوئے نہ رہیں۔

منسوخ شدہ یا کٹے پٹے بونڈ تبدیل  
کر دیئے جاتے ہیں یا ان کی تقسیم  
اداکر دی جاتی ہے،

پانچ سو روپے سے کم کے انعامات  
پولی ریشم کو انعاماتوں سے وصول  
کیجئے جاسکتی ہے۔

آج ہی  
خریدیئے!

انعامی بونڈ

کنہ کے لئے بچائیے • قوم کے لئے بچائیے



غنقریب  
شائع

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

میا  
جارحلیہ



# ماہِ دلبر

فرانسیسی ادب لطیف کا فنا نہ نہیں بلکہ وہ دل و زتاریخیے رومات جس کی نظیر کسی زبان کے



ادب میں آپ کو نظر نہ آئے گی !!  
اسے پہاڑوں نے سنا اور کانپ اُٹھے



★ زمین نے سنا اور تھرا اُٹھی ★ خدا نے سنا اور تادیر ملول رہا - افسانے  
جسے روح سنتی ہے اور آنسوؤں سے نہا کرنی طہارت و پاکیزگی حاصل کرتی ہے - ★

## محبت کا خراج

صرف وہ آنسو ہیں جو دل سے امنڈتے اور آنکھوں سے بے اختیار جاری ہو جاتے ہیں -

★ افسانے کہہ سکتے نہایت

یہ سناں حکم پڑھ کر آپ یہ خراج ادا کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں - ★ قیمت: تین روپے

نگار پاکستان ★ ۳۲ گارڈن مارکٹ ★ کراچی - ۳



غیر ضروری اور فاضل اخراجات کو روک کر بچائی ہوئی رقم

# اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ

میں جمع کیجئے

ایک سیونگز بینک اکاؤنٹ صرف پانچ روپے سے بھی کھلوا سکتے اور  
اعلیٰ درجہ کی بنکاری خدمات سے پوری طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔

آج ہی آپ

ہماری کسی بھی شاخ میں اپنا اکاؤنٹ کھولنے اور  
ہماری معیاری خدمات سے فائدے اٹھانے

یاد رکھئے 'اسٹینڈرڈ' اعلیٰ معیار خدمت کا نام ہے

اے میکین  
جنرل منیجر

ہیڈ آفس  
محمدی ہاؤس - کراچی